Regd. L. No. 7243 Phone: 80

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1977

اس پرچہ میں :

۱ ۔ حالیہ ہنگاموں پر تبصرہ
۲ ۔ مقالہ — قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں ۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام لاہور

ماہنامہ

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر ۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ..... ۱۸/- روپے غیر ممالک ..... ۳ پونڈ	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	جولائی سنہ ۱۹۷۷ء	شمارہ ۷

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ قوموں کی تعمیر، فکر سے ہوتی ہے۔ ہنگاموں سے نہیں! ——— (پرویز صاحب) ——— ۲۱

۳۔ بزمِ مذاکرہ ——— (قسط پنجم) ———

——— (منعقدہ کنونشن سنہ ۷۶ء) ——— ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبع علی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آنکھیں کہیں کہ دل نے ہمیں کر دیا خراب
اور دل کہے کہ آنکھوں نے ہم کو ڈبو دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے میرؔ! عشق میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملو دیا

۷ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ملک میں نئے انتخابات کا اعلان ہوا۔ ایک طرف برسرِ اقتدار، پیپلز پارٹی، زیرِ قیادت وزیرِ اعظم، مسٹر بھٹو تھی۔ اور دوسری طرف ملک کی نو مخالف پارٹیوں نے متحدہ محاذ قائم کیا۔ انتخابی مہم کے نام سے دونوں نے اپنی اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں جن میں ایک دوسرے کے خلاف وہ کیچڑ اُچھالی گئی کہ توبہ بھلی۔ ۷ر مارچ کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں متحدہ محاذ کو بالعموم شکست ہوئی، اور اس سے اگلے ہی دن، ان کی طرف سے انتخابات (یا مسٹر بھٹو) کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ اس سے مسلسل تین ماہ تک، یہ ملک انسانوں کی بستی نہیں، ایک جنگل بن گیا جس میں دہشت اور وحشت کے عفریتوں کی حکمرانی تھی، اور پُرامن شہریوں کی جان، مال، عزت، آبرو، سب ان کے رحم و کرم پر تھا ـــــ دونوں طرف سے دعویٰ یہ تھا کہ یہ سب کچھ ملک اور قوم کے مفاد، اور اسلام کے احیاء کے لئے کیا جا رہا ہے ـــ حالانکہ اس میں نہ ملک اور قوم کے مفاد کا کوئی تعلق تھا، نہ اسلام کا کوئی واسطہ۔ یہ چند افراد میں، اقتدار کے برقرار رکھنے اور حاصل کرنے کی رسّہ کشی تھی جس میں ملک، قوم اور اسلام کو سپر بنایا جا رہا تھا۔ تین ماہ کے جھگڑوں کے بعد ان متحارب فریقین میں مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جو اس فیصلہ پر منتج ہوا کہ ملک میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ یعنی اب بات پھر ۷ر جنوری سے شروع ہو گی اور خدا ہی جانے

(اور حاشیہ ص۳ کے نیچے ملاحظہ ہو۔)

کہ اس کے بعد اس بدنصیب ملک اور سوختہ بخت قوم پر کیا گزرے گی۔ اصل یہ ہے کہ جس قوم کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر دیا جائے، اس کا حشر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ قوم، قوم نہیں رہتی، بھیڑ بکریوں کا گلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ جسے، جس کا جی چاہے، جس قصاب کے ہاتھوں، جس قیمت پر چاہے فروخت کر دے۔ اس میں ان کی کوئی (SAY) ہی نہیں ہوتی ——— جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارا وہ سنہرا سہانا خواب جس کی عملی تعبیر کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، سر دست خوابِ پریشان بن چکا ہے۔ اب ہماری ساری آرزوئیں، سمٹ سمٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہو گئی ہیں کہ کسی طرح یہ خطۂ زمین ہی محفوظ رہ جائے۔ البتہ، جب تک ہمارے دم میں دم ہے، ہم یہ ضرور یاد دلاتے رہیں گے کہ ——— ہم نے اس خطۂ زمین کو کس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا، کہ یہ ہمارا جزوِ ایمان اور تقاضائے حیات ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اگر یہ خطۂ زمین محفوظ رہا (خدا اسے ابدالآباد تک محفوظ رکھے) تو بعد میں آنے والوں کو کم از کم اتنا تو معلوم ہو کہ اس مملکت کے حصول و قیام کا مقصد و منتہیٰ کیا تھا۔

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ
یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

جیسا کہ ہم نے کسی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا، ان ہنگاموں کے دوران ہمیں بکثرت استفسارات موصول ہوئے جن میں مختلف امور کے متعلق دریافت کیا گیا تھا کہ قرآنی روشنی میں ان کی پوزیشن کیا ہے؟ ہم نے اس زمانے میں ان استفسارات کا جواب دینا مناسب (یا مفید) نہ سمجھا کیونکہ جذبات کی شدت میں بہتر ناصح الٹا اثر کیا کرتا ہے۔ اب جبکہ فضا میں قدرے سکون پیدا ہو گیا ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اپنا فرض چکا دیں۔ چنانچہ ان استفسارات کے مختصر الفاظ میں جوابات درج ذیل ہیں۔ ہم اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دیں کہ ہمارا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے، نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی ہم عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں۔ ہمارا منصب (اور فریضہ) یہ ہے کہ امور مستفسرہ کے متعلق بتایا جائے کہ ہماری بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ کس کے حق میں جاتا ہے اور کس کے خلاف، اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ قرآن پیش کرتے وقت کسی سے لاگ یا کسی سے لگاؤ کا جذبہ ذرا بھی اثر انداز ہو جائے تو ہم اسے شرک سمجھتے ہیں۔ زیرِ نظر تبصروں میں بھی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آنے والے دنوں میں، ملک کا باہوش طبقہ شاید ان سے کچھ فائدہ اٹھا سکے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ (۱۱/۸۸)۔ ہمارا ارادہ تو تا بحدِ امکان اصلاح ہے۔

(۱) طاقت کا سرچشمہ کون ہے؟

سوال: پیپلز پارٹی نے اپنے سابقہ تین سلوگنوں میں، ایک اور کا اضافہ کیا ہے۔ اور وہ ہے ——— "طاقت کا

(صفحہ کا حاشیہ یہ ہے)

ؕ یہ اس وقت کی تحریر ہے جب یہ سطور حوالۂ قلم کی جا رہی ہیں۔ معلوم نہیں جس وقت یہ سطور قارئین کی نظروں سے گذریں، اس وقت صورتِ حالات کیا ہو، سیاست میں کچھ بھی متعین طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ (۱۶ جون ۱۹۷۷ء)

سرچشمہ عوام ہیں ؛ اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے اس پر اعتراض ہوا ہے کہ ایسا کہنا شرک ہے طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے اس نعرہ کی سند کیا ہے، اور مذہبی پیشوائیت کے اس دعوے کی حقیقت کیا ؟

جواب :- یورپ میں پہلے نظامِ ملوکیت رائج تھا جس میں طاقت کا سرچشمہ ایک فرد، یعنی بادشاہ ہوتا تھا۔ کلیسا نے اس کی جگہ لی تو دعوے کیا کہ طاقت کا سرچشمہ خدا ہے لیکن اس نے یہ طاقت ہمیں تفویض کر دی ہے کیونکہ ہم خدا کے نائب ہیں۔ اس طرح طاقت کا سرچشمہ پھر بھی انسان ہی رہے، لیکن ایک مقدس نقاب اوڑھے ہوئے۔ اسے تھیاکریسی کہتے ہیں۔ اس تصور کے خلاف فرانس میں انقلاب برپا ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جو ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ہاتھوں بروئے کار آتی ہے۔ اس کا نام نظامِ جمہوریت ہے۔ جب ہمارے ہاں مغربی جمہوریت کو اپنایا گیا تو یہ تصور بھی فطری طور پر اس کے ساتھ آیا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یہ ہے پیپلز پارٹی کے اس سلوگن کی سند۔

اقامتِ دین کے مدعیوں کی طرف سے جو نعرہ بلند ہوا وہ بظاہر بڑا مقدس نظر آتا ہے (کہ طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں خدا ہے) لیکن اگر آپ ذرا بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ نعرہ محض فریقِ مقابل کی مخالفت کے لئے ابھارا گیا ہے، ورنہ ان کے نزدیک بھی درحقیقت طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہیں۔ اس کا بیّن ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ پیپلز پارٹی کا دعوے ہے کہ عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی اور انہوں نے ہمیں اکثریت میں ووٹ دیئے تھے۔ متحدہ محاذ والوں کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے، عوام کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی، پیپلز پارٹی نے دھاندلی سے ووٹوں کی اکثریت اپنی طرف دکھا دی۔ اور اس کا ثبوت ہمارے جلسے، جلوس، ہنگامے، مظاہرے بہم پہنچاتے ہیں۔ جن میں عوام اس کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ انتخابات از سرِ نو کرائے جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ عوام کی اکثریت کس کے ساتھ ہے! آپ نے دیکھا کہ اسلام کے مدعی حضرات بھی وہی کچھ مانتے اور کہتے ہیں جو پیپلز پارٹی والوں کا دعویٰ ہے، کہ طاقت کا سرچشمہ عوام کی اکثریت ہے۔ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اگر (جیسا کہ آپ کہتے ہیں) طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، عوام نہیں، تو پھر آپ عوام کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی کیوں لگا رہے ہیں ؟

بات یہ ہے کہ غیر آئینی نظام میں طاقت کا سرچشمہ براہِ راست عوام ہوتے ہیں: وہ ہنگامہ آرائی اور ہلڑبازی سے اپنی من مانی کر لیتے یا کرا لیتے ہیں۔ لیکن آئینی نظام میں طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جس کے جرم قرار دینے کے لئے کوئی قانون موجود نہیں تو حکومت، اپنی لا انتہا مادی قوتوں (پولیس، فوج وغیرہ) کے باوجود اس شخص سے کوئی مؤاخذہ نہیں کر سکتی، خواہ پورے کے پورے عوام بھی اس مؤاخذہ کا مطالبہ کیوں نہ کریں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو قانون کی رو سے جرم ہے تو حکومت اسے اپنی گرفت میں لے

لیتی ہے اور مجرم ثابت ہونے کے بعد اسے سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اگر ملک کے تمام عوام بھی مطالبہ کریں کہ اس مجرم کو چھوڑ دیا جائے تو ان کی بات نہیں مانی جا سکتی۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ آئینی نظام میں طاقت کا سرچشمہ کوئی ایک فرد، افراد کا گروہ یا عوام نہیں ہوتے۔ طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے۔ اسی لئے قانون کی حکمرانی (RULE OF THE LAW) کو صحیح نظامِ سیاست قرار دیا جاتا ہے۔

مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہوتا ہے، اس لئے طاقت بالواسطہ انسانوں ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اس تصوّر کی جڑ کاٹ دی کہ طاقت کا سرچشمہ انسان ہوتے ہیں، خواہ وہ انسان ایک فرد ہو، ایک جماعت ہو یا عوام ہوں۔ اس نے کہا کہ طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے، لیکن قانون سازی کا حق اور اختیار انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ قوانین، خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی حکمرانی کسی دلیل یا ثبوت کی محتاج نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں "کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہے"۔ انسانوں کی دنیا میں یہ قوانین جو خدا کی کتاب میں محفوظ ہیں، نظامِ مملکت کی رُو سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نظام ان قوانین کی قوت کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتا ہے، اسے از خود کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔ ان قوانین کے صحیفہ کو الکتاب کہہ کر پکارا گیا ہے اور واضح طور پر بتا دیا گیا کہ لوگوں کے اختلافی معاملات کا تصفیہ انہی قوانین کی رو سے ہوگا۔ (۲/۲۱۳) حتیٰ کہ خدا نے خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) "اے رسول! تم ان میں، کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو"۔ یہ ہے مفہوم قرآن کریم کی ان آیات کا جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ: اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا۔ (۲/۱۶۵) "قوت تمام کی تمام خدا کو حاصل ہے"۔ یا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۸/۳۹) "خدا کے سوا کسی کو قوت حاصل نہیں"۔ مغربی جمہوریت کی سیکولر حکومت کھلے بندوں اعتراف اور اعلان کرتی ہے کہ طاقت، عوام کے نمائندوں کے وضع کردہ قوانین کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآنی حکومت کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ طاقت قاطبۃً خدا کی کتاب میں دیئے گئے قوانین کو حاصل ہوتی ہے، اور حکومت یا مملکت ان قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ یا ایجنسی ہوتی ہے۔ اور بس۔ حکومت کی ایک تیسری قسم ہے اور وہ ہے مقیاکریسی جس میں طاقت، مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جسے وہ ـــــ "خدا کے نام پر" استعمال کرتی ہے۔ یہ استبداد کی بدترین شکل ہوتی ہے جس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

(۲) کیا عورت سیاست میں حصّہ لے سکتی ہے؟

سوال:۔ حالیہ ہنگاموں میں، عورتوں کے جلوس بھی نکلتے رہے اور وہ مردوں کی طرح سیاست میں حصّہ لیتی رہیں۔ ان میں سے اکثر جلوسوں کی قیادت محترمہ بیگم مودودی صاحب نے کی۔ کہا جاتا ہے

کہ مودودی صاحب، عورتوں کے سیاست میں حصّہ لینے کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر خود اُن کی بیگم صاحبہ نے ایسا کیوں کیا؟

جواب: جی ہاں! یہ صحیح ہے کہ مودودی صاحب عورتوں کے سیاست میں حصّہ لینے کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب تدوینِ دستور کا مسئلہ زیرِ غور تھا تو مودودی صاحب نے بھی اپنی دستوری تجاویز پیش کی تھیں۔ ان میں ایک شق یہ بھی تھی:

مجالسِ دستور ساز میں رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔

بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو مودودی صاحب نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ستمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت کے "اشارات" میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی۔ اس میں پہلے یہ کہا گیا کہ:

تیسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ عورتوں کو مجالسِ قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہئے۔ اس باب میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کونسے اسلامی اصول ہیں جو ان کی رکنیت میں مانع ہیں اور قرآن و حدیث کے وہ کونسے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے (اپنے انداز کے مطابق) قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویؐ کی رُو سے ثابت کیا کہ "سیاست و ملک داری عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے"۔ ازاں بعد انہوں نے لکھا کہ:

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں، تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ، حضرت عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگِ جمل میں نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اوّل تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی واضح ہدایت موجود ہو، اس میں کسی صحابیؓ کا کوئی ایسا انفرادی فعل حجت اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو، ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہؓ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں، مگر اس غرض کے لئے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، نہ اس غرض کے لئے کہ ہم اللہ اور رسولؐ کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں ـــــ پھر جس فعل کو، اُسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا اور جس پر بعد میں خود اُم المؤمنینؓ بھی نادم ہوئیں، اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لئے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

مختصراً انہوں نے اس بحث سے ثابت کیا کہ:

(۱) عورتوں کا سیاست میں حصہ لینا، خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف، اور اسلام میں بدعت ہے۔

(۲) حضرت عائشہؓ کا سیاست میں حصہ لینا خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی اور ان کی لغزش تھی جسے جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا اور جس پر وہ بعد میں خود بھی نادم ہوئیں۔

اس سے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ان سیاسی ہنگاموں میں عورتوں کی شرکت، اور مودودی صاحب کی بیگم صاحبہ کی قیادت، خود مودودی صاحب کے فیصلہ کی رُو سے، شرعاً کیا حیثیت رکھتی ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، متحدہ محاذ میں شریک یا اس سے وابستہ علماء حضرات میں سے کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اس کے خلاف صرف ایک آواز اٹھی۔ اور وہ آواز تھی ہفت روزہ المنبر (لائل پور) کی طرف سے، جو اگرچہ متحدہ محاذ میں براہِ راست شریک نہیں، لیکن ان کا مؤید اور حامی ہے۔ اس جریدہ کی ۱۸ اپریل ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں تحریر تھا۔

عورتوں کے جلوس فی الفور بند کئے جائیں

(پاکستان قومی اتحاد سے اسلام کے نام پر اپیل)

حالات کی سنگینی ——— سے انکار کیا، اس سے قلب و ذہن پر جو گزر رہی ہے، المنبر کو ایک نظر دیکھنے والے بھی اس سے آگاہ ہیں ——— لیکن اس حالت میں بھی، اسلامی شریعت کی کھلی خلاف ورزی کسی بھی تاویل اور واضح نصوص کے خلاف استدلال سے قابلِ برداشت نہیں۔

عورت ——— ماں، بیٹی، بہن، ہر رشتے کی بنا پر واجب الاحترام ہے اور مغرب کی ملعون اور اشتراکی ملحدانہ تہذیبوں نے عورت کو "آزادی" اور مرد سے مساوات کا فریب دے کر، اسے گھر کی چار دیواری سے باہر نکال کر، جو بے آبرو کیا ہے اور اسے رونقِ محفل سے، مل مزدور اور سیاسی ہنگاموں کے راستے پر ڈال کر، جس طرح ذلیل کیا ہے ——— انتہائی رنج و الم کی بات ہے کہ مسلم اقوام بھی، مدنی معاشرت اور قرآنی حدود سے روگردانی کر کے یورپین اور اشتراکی اقوام کے ملعون اعمال کو اختیار کرنے لگی ہیں۔

اس غلط روش کا ایک دردناک مظاہرہ سیاسی امور و معاملات میں، عورتوں کے جلوس ہیں، جو ہر ہنگامی مرحلے میں، نکلنے شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس ہفتے میں قومی اتحاد کی تحریک میں بھی اس کا تیز رو آغاز ہوا ہے۔

اس کے بعد اس جریدہ میں کہا گیا تھا کہ ان مظاہروں اور ہنگاموں میں نصرتِ خداوندی کے مشاہدات ہوئے اور آخر میں تحریر تھا:۔

القصہ ——— اس نصرتِ الٰہیہ کے مشاہدے کے بعد، اسلام کے فریضہ حجاب (پردہ) کو

نظرانداز کرکے اور عورتوں کو گھروں کی چاردیواری سے باہر سڑکوں پر نکال لانے اور آگے چل کر عورتوں کے جلوس کے جاروں طرف اخلاق باختہ افراد کے جمگھٹوں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ چلنے اور ان میں گھس آنے کی تمام لعنتوں کے آغاز کے الیے سے بچنے کا قطعی تقاضا ہے کہ اس سلسلے کو فوراً بند کیا جائے اور ایک محکم شرعی حکم میں کسی بھی تاویل کے سہارے رخنہ اندازی نہ کی جائے۔

مسئلہ اس وضاحت سے زیادہ صراحت اور اس طرزِ ادا سے کہیں زیادہ شدت کا متقاضی ہے۔ مگر ہم احوالِ ناظروں کے پیشِ نظر، اسی مختصر مجمل عرض داشت پر اکتفا کرتے ہیں اور ہر جگہ کے کارکنانِ پاکستان قومی اتحاد اور مرکزی راہ نماؤں سے اسلام کی عظمت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ "وہ ہر نقصان کو برداشت کرتے ہوئے بھی اس فتنے کے دروازے کو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بند کریں"۔

لیکن اس باب میں مودودی صاحب کا جواب بڑا دلچسپ ہے۔ ہفتہ وار جریدہ، چٹان (لاہور) کی ۱۱ اپریل ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں، مدیر چٹان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جو انہوں نے مودودی صاحب سے لیا تھا۔ اس انٹرویو میں، زیرِ نظر موضوع پر حسبِ ذیل سوال اور جواب غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:۔

سوال:۔ قومی اتحاد کی حمایت میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی سڑکوں پر نکل آئیں ہیں، قومی اتحاد کے مخالفین یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے تو عورت کو گھر کی چاردیواری میں رہنے کا تصور پیش کیا تھا اور آج اپنے مؤقف کی حمایت کے لئے خود اپنی عورتوں کو سڑک پر لا کھڑا کیا ہے؟

جواب:۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ عورت کو گھر کی چاردیواری سے باہر نہیں نکلنا چاہئے جبکہ پردے کے ساتھ عورت کو باہر نکلنے کی مکمل آزادی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب، کس سادگی اور پُرکاری سے، طرح دے کر نکل گئے ہیں۔ سوال یہ نہیں تھا کہ عورتوں کو گھر سے نکلنے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ انہیں سیاست میں حصہ لینے کی اجازت ہے یا نہیں ——— مودودی صاحب اسے بالکل گول کر گئے ہیں۔ یہ ان کی خاص ٹیکنیک ہے۔

(۳) آدھی رات کے وقت اذانیں

سوال:۔ ان ہنگاموں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عشاء کی نماز کے دو تین گھنٹے بعد مساجد سے لاؤڈ سپیکروں پر اذانیں دی جاتی تھیں اور مختلف وقفوں کے ساتھ ان کا سلسلہ آدھی رات تک

جاری رہتا تھا۔ اس سلسلہ میں، محترم بدیع الزمان کیکاؤس' (سابق جج۔ سپریم کورٹ آف پاکستان) کی طرف سے حسبِ ذیل اپیل بھی شائع ہوئی تھی۔

دُعا اور مدد کی اپیل

علمائے کرام اور حق و انصاف کے طلبگاروں پر پولیس اور سیکورٹی فورس جو تشدد کر رہی ہے، اس پر ہر شریف شہری رنجیدہ اور شرمندہ ہے۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ۸ر اپریل کو نمازِ جمعہ میں خاص اہتمام سے شریک ہو کر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے آئین کی سربلندی، ملک کی سلامتی، منصفانہ معاشرے کے قیام اور نبی اکرم ﷺ کے مطالبے کے لئے اپنے عزم کو دہرانے کے ساتھ ساتھ ظلم سے نجات کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں اور اسی شب اور اس کے بعد ہر روز بعد نماز عشاء۔ اللہ کی اعانت طلب کرنے کے لئے

باآوازِ بلند اذانیں دیں!

(نوائے وقت لاہور ۸ر اپریل ۱۹۷۷ء)

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:۔ اذان کے متعلق، قرآن مجید نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ "ندا برائے صلوٰۃ" ہے۔ یعنی نماز کے لئے بلانے کی آواز ——— اس میں کہا گیا ہے۔ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ...... (۶۲/۹) "جب نماز کے لئے آواز دی جائے" ——— یا: اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ۔ (۵/۵۸) "جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو......" خود اذان کے مرکزی الفاظ ——— حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ "آؤ نماز کے لئے" اس کی بیّن شہادت ہیں۔

باقی رہی کیکاؤس صاحب کی اپیل کہ "اللہ کی اعانت طلب کرنے کے لئے باآوازِ بلند اذانیں دیں" تو اس پر سوائے اس کے کہ انسان خون کے آنسو بہا کر رہ جائے اور کیا کرے۔ علمِ خداوندی کی یہ کیفیت ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ۔ (۳/۵) "ارض و سما میں کوئی شے نہیں جو خدا سے مخفی ہو" اس قسم کے خدائے علیم و خبیر سے، لاؤڈ سپیکروں پر دو دو گھنٹے، اذانیں دے دے کر اعانت طلب کرنا، کم از کم ہماری تو روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن جس دماغ کی یہ اختراع تھی، اس کی داد دیئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ ان ہنگاموں میں لاؤڈ سپیکروں کے استعمال پر پابندی تھی، بجز اذان یا خطبہ کے۔ اس استثناء سے اس طرح فائدہ اٹھانے کا خیال کسی عام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ پراپیگنڈہ کے اس طریق کے مقابلہ میں حکومت کے تمام ذرائع ابلاغ (ریڈیو۔ ٹیلی ویژن) مات تھے۔ جب راتوں کی تنہائیوں میں بے وقت اذانوں کا

سلسلہ شروع ہوتا تھا تو بچوں تک اُٹھ اُٹھ کر پوچھتے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا پراپیگنڈہ کا اس سے زیادہ مؤثر اور وسیع ذریعہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر ثواب کا ثواب!

(۴) دھاندلی کا جواب دھاندلی۔

سوال:۔ مسٹر بھٹو کے خلاف الزام یہ تھا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی۔ اس دھاندلی کے ازالہ کے لئے جو طریق اختیار کیا گیا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

جواب:۔ یہ سوال ہمارے زیرِ بحث نہیں کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی یا نہیں۔ اور اگر ہوئی تو کس حد تک۔ ہم اپنے آپ کو اس سوال تک محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ اس دھاندلی کے جواب میں جو کچھ کیا گیا، اس کی کیا حیثیت تھی؟

سوال یہ ہے کہ دھاندلی کہتے کسے ہیں؟ جو حرکت قاعدے قانون کے خلاف کی جائے وہ دھاندلی کہلاتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس دھاندلی کے ازالہ کے لئے جو کچھ کیا گیا وہ کونسے قاعدے اور قانون کے مطابق تھا؟ ملکی قانون تو اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کوئی فرد، یا جماعت، قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر فسادات برپا کرے۔ ہنگامے کھڑے کرے۔ جانوں کو ہلاک اور املاک کو تباہ کرے۔ لوگوں کو قانون شکنی کے لئے اکسائے۔ ملک کا تو کوئی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا ملکی قانون کی رو سے یہ تمام اقدامات خود دھاندلی کے زمرہ میں شمار ہوں گے۔ باقی رہا اسلام، تو کسی اصلاح کے لئے اس قسم کے اقدامات کا تو اسلام تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تخریب کا ازالہ تعمیر سے، اور برائیوں کی مدافعت بھلائیوں سے کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ (۱۱/۱۱۴) یاد رکھو! سیئات (برائیوں) کا ازالہ حسنات (بھلائیوں) ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ۔ (۲۳/۹۶) شر کی مدافعت بطریقِ احسن خیر سے کرو۔ وہ مومنین کا شعار یہ بتاتا ہے کہ: وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳/۲۲) وہ، برائیوں کو بھلائیوں کے ذریعے دور کرتے ہیں۔ فساد انگیزی اس کے نزدیک سنگین ترین جرم، اور مبغوض ترین روش ہے۔ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (۲/۲۰۵) اس کا ارشاد ہے، اور ایسا فساد جس کا نتیجہ ہلاکتِ حرث و نسل ہو، اس کے نزدیک سخت مذموم ہے۔ (۲/۲۰۵) ہلاکتِ نسل میں اگر جانوں کا ضیاع آتا ہے تو ہلاکتِ حرث میں، ہر قسم کی املاک کی تباہی شامل ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو بھی سامنے لاتا ہے جو بزعمِ خویش، اصلاح کی غرض سے فساد برپا کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ (۲/۱۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔ (۲/۱۲) آگاہ رہو کہ یہ اصلاح

کرنے والے نہیں ۔ فساد بپا کرنے والے ہیں ۔ لیکن یہ اس بات کو سمجھتے نہیں ۔ یعنی اس بات کو نہیں سمجھتے کہ جو فساد ، اصلاح کی غرض سے بھی کیا جائے ، وہ بھی فساد ہی ہوتا ہے ۔ غلط کو اگر غلط کے ذریعے مٹایا جائے تو غلط پھر بھی باقی رہتا ہے ۔ آپ تاریکی کو تاریکی کے ذریعے دُور نہیں کر سکتے ۔ روشنی کے ذریعے دور کر سکتے ہیں ۔ اسلام تو بیرونی دشمنوں کے خلاف بھی جنگ کی اجازت اس وقت دیتا ہے ، جب اپنی حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو ، اور اس جنگ میں بھی بلا وجہ اتلافِ جان و اموال کی اجازت نہیں دیتا ۔

ان ہنگاموں میں (فریقین کی) بہت سی جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ مرنے والے اور مارنے والے دونوں مسلمان تھے ۔ ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کا قتل عنداللہ کس قدر سنگین جرم اور ناقابلِ معافی گناہ ہے اس کا اندازہ سورۃ النسا کی اس آیت سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ :-

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ (۴/۹۳)

جس نے کسی مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ۔ اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہو گی اور خدا نے اس کے لئے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے ۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن ہنگاموں میں ، مسلمان ، مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوں ، ان کی حیثیت کیا ہو گی ؟ لیکن ہمارے ہاں تو بات کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے ۔ یہاں ان فسادات میں ہلاک ہونے والوں کو شہید قرار دیا جاتا ہے اس سے شہادت جیسے بلند ترین مرتبہ کو اس قدر پامال کر دیا گیا ہے کہ اس کے تصوّر سے روح کانپ اٹھتی ہے ۔ کہاں وہ مقتولین فی سبیل اللہ جن کے متعلق خود خداوند تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ انہیں مردہ کہنا تو ایک طرف مردہ سمجھنا بھی نہیں چاہیئے ۔ اور کہاں مسلمانوں کے باہمی فسادات میں ہلاک ہونے والے ! ان (فریقین) سے پوچھنا چاہیئے کہ اگر آپ کی پارٹی کا ہلاک ہونے والا "شہید" ہے تو جس فریق مقابل کے ہاتھوں وہ ہلاک ہوا ہے ، اسے آپ کیا کہیں گے ؟ اصل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی مذہبی اور بے حد جذباتی واقع ہوئی ہے ۔ اسے اس قسم کے نعروں سے بہت جلد مشتعل کیا جا سکتا ہے —— خود مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ :-

> ہماری کل آبادی کا نوے فی صد ، بلکہ اس سے بھی زیادہ حصہ عوام کا ہے ۔ یہ لوگ اسلام سے گہری عقیدت اور مخلصانہ محبت رکھتے ہیں ...... لیکن جس اسلام سے یہ عشق رکھتے ہیں اس کو جانتے نہیں ...... اس لئے ہر ضال و مضل شخص اسلام کا لباس پہن کر ان کو جھکا سکتا ہے ۔ (جماعتِ اسلامی ۔ مقصد ، تاریخ اور لائحہ عمل ۔ ۱۹۵۳ء ایڈیشن صفحہ ۸۹) ۔

اس طرح ان سادہ لوح عوام کے نازک مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے ان سے ہنگامے برپا کرائے جاتے ہیں ۔ یہ حضرات اکثر کہہ دیتے ہیں کہ ان مظاہروں میں حصہ لینے والوں سے ہم تو نہیں کہتے کہ وہ لوٹ مار کریں ۔ عمارات کو آگ لگائیں ۔ فسادات برپا کریں ۔ ایک دوسرے کو قتل کریں ۔ اس لئے اس کے ذمہ دار ہم نہیں ۔ لیکن ان

حضرات کو کون بتائے کہ جو مظاہرے آپ کراتے ہیں وہی تو ان تمام فسادات اور قتل و غارت گری کا موجب بنتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ جو چیز فساد کا ذریعہ بنتی ہے وہ خود فساد سے کم نہیں ہوتی۔ جرائم کے لئے ذرائع مہیا کرنے والے بھی برابر کے مجرم ہوتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے کہ:۔

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ۔ (۱۶/۲۵)

وہ قیامت کے دن اپنے جرائم کا بھی پورا پورا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے جرائم کا حصہ بھی جنہیں انہوں نے بغیر سوچے سمجھے غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔

ان لیڈروں میں سے کسی نے کبھی اپنی پارٹی کے ہنگامے کرنے والوں کے ان اقدامات کی مذمت نہیں کی۔ وہ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ـــــ اور اس سے بڑی حوصلہ افزائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان ہنگاموں میں مرنے والوں کو شہید قرار دے دیا جائے! علاوہ ازیں ان مظاہروں میں، جس قسم کی ہلڑبازی ہوتی رہتی ہے، ان میں سے کسی نے بھی اس کی مذمت میں ایک لفظ نہیں کہا ـــــ جب ۱۹۶۸ء میں اس قسم کے ہنگامے برپا ہوئے تھے تو جماعتِ اسلامی کے سیکرٹری چوہدری رحمت علی صاحب نے اخبارات میں مندرجہ ذیل بیان شائع کیا تھا:

گذشتہ دو دن سے مسلسل مغربی پاکستان میں جگہ جگہ طلباء کے اجتماع اور مظاہروں اور پولیس کے تشدد کی خبریں آ رہی ہیں اور کل اور آج راولپنڈی میں تین شہری، پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔ جگہ جگہ ان ہنگاموں میں زخمی ہونے والے افراد کی تعداد بھی خاصی بتائی گئی ہے اور انفرادی اور اجتماعی املاک کا نقصان بھی کافی ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں صوبے کی تمام یونیورسٹیاں اور بڑے بڑے شہروں کے سب تعلیمی ادارے غیر معین مدت تک بند کر دیئے گئے ہیں۔ تشدد اگرچہ بیشتر حکومت ہی کی طرف سے روا رکھا جاتا ہے لیکن یہ خواہ حکومت کی جانب سے ہو یا مظاہرین کی طرف سے دونوں صورتوں میں قابلِ مذمت ہے۔

(ایشیا - ۱۷ر نومبر ۱۹۶۸ء)

لیکن حالیہ ہنگاموں میں جماعتِ اسلامی (یا متحدہ محاذ میں سے کسی اور پارٹی) کی طرف سے اس قسم کا اعلان کہیں نہیں ہوا۔ اس دفعہ یہ، حکومت کے تشدد ہی کی مذمت کرتے رہے ہیں۔

---

(۵) ہم (مسٹر) بھٹو کو مجبور کر دینا چاہتے ہیں

سوال:۔ متحدہ محاذ کے راہ نما کہتے ہیں کہ ہم مسٹر بھٹو کو مجبور کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے مطالبات منظور کرے۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ کیا یا کرایا جا رہا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس

کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب:۔ اسلام تو قانون کی حکمرانی چاہتا ہے اس لئے وہ مجرمین کو بذریعہ قانون ہی مجبور کرتا ہے کہ وہ ارتکابِ جرم سے باز رہیں۔ وہ تو باغیوں تک کو بھی گرفتار کر کے ان کے خلاف قانون کے مطابق مقدمہ چلاتا ہے۔

جہاں قانون اپنے ہاتھ میں لیا جاتا ہے وہاں دوسرے کو مجبور کر کے اپنے مطالبات منوانے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جسے عام طور پر "قبائلی" اختیار کرتے ہیں۔ وہ کسی شخص کے بیٹے، بیٹی یا کسی اور عزیز کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ اتنا روپیہ ادا کر دو، ورنہ ہم اس یرغمالی کو ہلاک کر دیں گے۔ اس طرح اس شخص کو اپنے مطالبات منوانے پر بالواسطہ مجبور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کو آج کل "ماڈرن" بنا لیا گیا ہے اور کبھی کسی ہوائی جہاز کو اغوا کر لیا جاتا ہے، کبھی کسی ریلوے ٹرین کو ـــــ ابھی حال ہی میں ہالینڈ میں ایک ٹرین کے مسافروں کے علاوہ، ایک اسکول کے بچوں اور استادوں کو یرغمالی بنا لیا گیا۔ اس قسم کے اغوا کردہ جہاز یا ٹرین کے مسافروں یا اسکول کے بچوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہوتا۔ نہ اغوا کرنے والے ذاتی طور پر ان سے واقف ہوتے ہیں، نہ یہ یرغمالی بنائے ہوئے مظلوم ان اغوا کنندگان سے واقف اور نہ کسی جرم کے مرتکب۔ لیکن ان بیچاروں کو جو اذیت پہنچتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سب سے بڑی اذیت یہ کہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں دن گذارتے ہیں۔ وہ خود قطعاً بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا جسے وہ پورا کر کے رہائی حاصل کر لیں، وہ پھانسی کے تختے پر کھڑے، ان لوگوں کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہے ہوتے ہیں جن سے اغوا کنندگان اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ وہ اگر ان کے مطالبات مان لیں تو ان بے گناہ مظلوموں کی جان بچ جاتی ہے، نہ مانیں تو انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے ـــــ بلا جرم و خطا ہلاک!

ہمارے ان راہ نماؤں نے مسٹر بھٹو سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے اسی قسم کا طریق اختیار کیا۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کو براہِ راست مجبور نہیں کیا۔ انہوں نے اس ملک اور قوم کو یرغمال بنا لیا اور مسٹر بھٹو سے کہا کہ ہمارے مطالبات تسلیم کرو، ورنہ ہم (ملک اور قوم) کو تباہ کر دیں گے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس تین ماہ کے عرصہ میں اس بے بس اور مجبور قوم پر وہی کچھ نہیں بیتی جو کچھ اس اسکول کے بچوں یا اس ٹرین کے مسافروں پر بیتی تھی! قوم میں لاکھوں کی تعداد میں وہ مزدور تھے جو روزانہ اجرتوں سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ وہ اس تمام عرصہ بے کار رہنے کی وجہ سے بھوکوں مرتے رہے۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے کاروباری لوگ، خوانچہ فروش وغیرہ تباہ ہو گئے۔ کرفیو کے زمانے میں، کتنے مریض دوائی نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ کتنے بچوں کو دودھ نہ ملا اور وہ بلکتے رہے۔ ملک کے تمام اسکول اور کالج بند رہے اور طالب علموں کی عمریں تباہ ہو گئیں۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ان تمام ہنگاموں میں کون تنگ ہوا؟ مسٹر بھٹو (جن کے خلاف آپ کو شکایات تھیں) یا یہ قوم جس نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا تھا؟

اور آگے بڑھئے۔ اٹارنی جنرل، مسٹر یحییٰ بختیار نے، سپریم کورٹ میں، اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے ان نقصانات کی تفصیل بتائی ہے جو ان ہنگاموں کی وجہ سے ۱۴ر مارچ سے ۲۷ر مئی تک کے عرصہ میں ہوئے۔

(۱) عوامی جلوس (۳۹۹۰)۔ عورتوں کے جلوس (۲۴۸)۔ وکلا کے جلوس (۹۲)۔ علماء کے جلوس (۱۸)۔ طلبا کے جلوس (۲۴۸)۔ بچوں کے جلوس (۵۷)۔ (ان جلوسوں میں بہ ہیئت مجموعی قوم کا جس قدر وقت، توانائی، اور دولت ضائع ہوا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے)۔

(۲) اتلافِ جان۔ فریقین کے عوام کے ہلاک شدہ (۲۴۱)۔ زخمی (۱۱۹۵)۔ قانون کا تحفظ کرنے والے (۹) افراد ہلاک اور (۵۳۱) زخمی ہوئے۔ مفتی محمود صاحب نے کہا ہے کہ اس تحریک کے دوران ایک ہزار سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ (نوائے وقت ۱۵ر جون ۱۹۷۷ء)

(۳) لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات۔ (۱۶۲)

(۴) املاک کا اتلاف۔ سڑکوں پہ گاڑیاں جلائی گئیں۔ (۱۶۲۲) ان میں وہ گاڑیاں شامل نہیں، جو "ری پبلک موٹرز" کی کارگہ سے متعلق تھیں۔ تنصیبات تباہ کی گئیں (۱۸)۔ دکانیں جلائی گئیں (۷۴) بینک لوٹے یا جلائے گئے (۵۸)۔ ہوٹل تباہ ہوئے (۷)۔ سنیما تباہ، یا خاکستر ہوئے (۱۱) دفاتر تباہ ہوئے (۵۶)۔ ریل کے ڈبے جلائے گئے یا تباہ ہوئے۔ (۲۷)۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۷ر جون ۱۹۷۷ء)

کیا ہمارے یہ حضرات بتائیں گے کہ یہ نقصان مسٹر بھٹو کا ہوا جنہیں یہ مجبور کرنا چاہتے تھے یا قوم کا، جس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا؟

ابھی ان لوگوں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی جو اس دوران میں جیلوں میں گئے۔ اس سے ان کا اور ان کے اہلِ خاندان کا کس قدر نقصان ہوا، اور قوم کا کس قدر زیاں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس تمام دوران میں صنعت و حرفت کے بند رہنے یا جہازوں کے سلسلۂ آمد و رفت کے معطل ہو جانے سے ملک کی معیشت پر کس قدر اثر پڑا، اس کا پتہ بعد میں چلے گا۔ یہ نقصان اربوں تک پہنچے گا اور اس کا پورا کرنا ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک کے تو بس کی بات ہی نہیں ہو گی۔ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ یہ نقصان مسٹر بھٹو کی ذات کا ہوا یا قوم کا! اور اس کے بعد ان حضرات سے پوچھئے کہ اس طرح آپ نے مسٹر بھٹو کو تنگ یا مجبور کیا یا بیچاری قوم کو! ——— آپ کو اپنے مطالبات منوانے کے لئے، ملک اور قوم کو اس قدر نقصان پہنچانے کا کیا حق پہنچتا تھا؟

ان کی طرف سے کہا جائے گا کہ جب رائج الوقت حکومت کے ہاتھوں ملک کی حالت اس درجہ خراب ہو چکی تھی تو اس میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے، اس قسم کے اقدامات ناگزیر تھے۔ اس کے لئے کوئی پُرامن طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا! اربابِ اقتدار نے لامحدود اختیارات ہاتھ میں لے لئے تھے۔ ان

سے ان اختیارات کے چھیننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا!

ہم بھی اس سے متفق ہیں کہ ملک کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے اور ارباب اقتدار نے لامحدود اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اُس آئین پر جس کے تحت ارباب اقتدار کو اس قدر وسیع اختیارات حاصل ہو گئے! اس آئین کی شقوں میں براہِ راست بھی اس کی گنجائش موجود تھی۔ جن کی رو سے اربابِ حکومت کو ایسے اختیارات حاصل ہو جائیں، اور اس قسم کی ترمیمات کرنے کی گنجائش بھی۔ اس طرح اس کی ذمہ داری' اس آئین پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس آئین پر ان حضرات کے دستخط موجود ہیں جنہوں نے یہ تحریک چلائی تھی۔ ان سے پوچھنے کی بات یہ ہے کہ جب آپ نے اس آئین پر دستخط کئے تھے تو اُس وقت آپ نے نہیں دیکھا تھا کہ اس میں اس قدر گنجائشیں موجود ہیں جن کی رُو سے اربابِ حکومت کو لامحدود اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب آپ نے یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے اس آئین پر دستخط ثبت فرما دیئے تھے تو اس کے عواقب سے آپ کس طرح بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں؟ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا وقت وہ تھا؛ اس سے تغافل یا تساہل تو آپ نے برتا اور اس کا خمیازہ اِس بدنصیب قوم اور سوختہ بخت ملک کو بھگتنا پڑا! اور طرفہ تماشا یہ کہ اِسے اب قوم کی خدمت قرار دیا جا رہا ہے!

وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا

حق کی بات تو یہ ہے کہ جن حضرات نے اس غلطی کا ارتکاب کیا تھا انہیں چاہیئے کہ وہ خود اس کا کفارہ ادا کریں۔ وہ اپنے کفارہ کے لئے قوم کو قربانی کا بکرا کیوں بنائیں؛

---

(۶) اِسلامی نظام کا قیام

سوال:۔ کیا ان حضرات کے زیرِ اقتدار ملک میں اسلامی نظام قائم ہو سکے گا؟

جواب:۔ آپ اِسلامی نظام کے قیام کا ذکر کر رہے ہیں! یہ حضرات اپنے زیرِ اقتدار، ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکیں گے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سالِ گذشتہ حرم کعبہ اور مدینہ طیبہ کے امام یہاں تشریف لائے تھے اور لاکھوں مسلمانوں نے ازرہِ عقیدت ان کے پیچھے نمازیں پڑھی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد، اُس فرقہ کی طرف سے جس سے وابستہ حضرات اب متحدہ محاذ میں شامل ہیں؛ فتویٰ صادر ہوا تھا کہ جن لوگوں نے ان اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھی تھیں' وہ نمازیں باطل تھیں۔ انہیں وہ نمازیں دوبارہ پڑھنی چاہئیں۔ متحدہ محاذ میں، اُن اماموں کے فرقہ (اہلِ حدیث) سے متعلق مولوی صاحبان بھی شامل ہیں؛ اور جنہوں نے وہ فتویٰ دیا تھا (بریلوی حضرات) ان کے پیرو بھی شامل۔ باقیوں کو تو چھوڑیئے۔ یہ فرمایئے کہ کیا ان فرقوں سے وابستہ حضرات، ایسا اسلامی نظام قائم کر سکیں گے جس پر یہ متفق ہوں! ـــــ ان حضرات نے، اقامتِ دین۔ اسلامی نظام۔ نظامِ شریعت۔ نظامِ مصطفیٰ وغیرہ اصطلاحات

کو دانستہ مبہم رکھ چھوڑا ہے۔ (فقرے وہی توڑ ہوتے ہیں جنہیں مبہم رکھا جائے) اگر یہ حضرات اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق ان اصطلاحات کی تشریح کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ متحدہ محاذ کا شیرازہ بہاڑ کے تنکوں کی طرح بکھر جائے گا۔ اس محاذ میں شامل علماء حضرات جن مختلف فرقوں سے یہ متعلق ہیں، آپ تاریخ کے اوراق اُلٹئے، اور دیکھئے کہ عقائد کے اختلاف کی بنا پر ان میں کس قدر باہمی خوں ریزیاں ہوتی رہی ہیں۔ آج بھی ان میں سے ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے صادر کر رکھے ہیں، اور مودودی صاحب کے خلاف ان سب نے مشترکہ طور پر فتوے لگا رکھے ہیں! آپ کا کیا خیال ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو کافر سمجھتے ہیں وہ مشترکہ اسلامی نظام قائم کر دیں گے؟ ان کی طرف سے ایک بات بطور قدر مشترک پیش کی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ مملکت کے قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ مودودی صاحب نے آج سے سات سال قبل اعلان کیا تھا کہ:-

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (ایشیاء - ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

آپ سوچئے کہ کیا یہ حضرات اس ناممکن کو ممکن بنا سکیں گے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ اپریل میں مسٹر بھٹو نے ان حضرات کو دعوت دی تھی کہ آپ آئیے اور چھ ماہ میں احکام شریعت کا ضابطہ مرتب کر دیجئے، تو سب سے پہلے مودودی صاحب نے اس دعوت کو مسترد کر دیا تھا۔ نوائے وقت مورخہ ۱۹ اپریل ۷۷ء میں یہ خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی:-

> جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی وزیراعظم کی طرف سے پیش کردہ سیاسی فارمولا مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے آج ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت اصل مسئلہ نفاذ شریعت کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وزیراعظم، پیپلز پارٹی کے چیئرمین کے طور پر قومی اتحاد کی قیادت سے اس مسئلہ پر بات چیت کریں کہ نئے انتخابات کرانے کے لئے ایک عارضی حکومت کس طرح تشکیل دی جائے۔ مولانا مودودی صاحب نے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کے بارے میں وزیراعظم بھٹو کی تجویز بھی مکمل طور پر مسترد کر دی ہے۔

یہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ اگر نفاذِ شریعت کا سوال درمیان میں آ گیا تو ایک طرف متحدہ محاذ کے اتحاد کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ جائے گی، اور دوسری طرف یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ ان حضرات کی طرف سے اسلامی نظام کا دعویٰ اور مطالبہ محض سیاسی حربہ تھا۔

---

(۷) ملک کا مستقبل

سوال:- کیا ان حضرات کے ہاتھوں ملک محفوظ رہ سکے گا؟

جواب:۔ اس سوال کا جواب ان حضرات کے ماضی سے خود بخود مل جاتا ہے۔ اس محاذ کے سرکردہ حضرات، (سابق) جمعیت العلماء ہند کے مفتی محمود صاحب، جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور صاحب۔ اور (سابق) مجلس احرار کے نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب ہیں۔ ان تینوں کی پارٹیاں، اپنے تصور اسلام کے مطابق تقسیم ہند کو اسلام کے خلاف قرار دیتی تھیں اور اس لئے مطالبۂ پاکستان کے مخالف تھیں۔ ان کا اسلام کا تصور آج بھی وہی ہے جو اُس وقت تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ حضرات اسلام کے علمبردار ہوتے ہوئے تقسیم ہند کو برقرار رکھنے کے حق میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ سیکولر نقطۂ نگاہ سے، چوتھی پارٹی ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو سابق نیپ کے باقیات میں سے ہیں۔ نیپ کے لیڈروں کے خلاف، اس وقت بھی پاکستان کے خلاف سازش کا مقدمہ چل رہا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاتھوں ملک کا جو مستقبل ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔

اس وقت یہ ملک اس مقام پر کھڑا کانپ رہا ہے جس کے متعلق (محاورۃً) کہا جاتا ہے کہ) پیچھے آگ ہے اور آگے سمندر۔ اگر اقتدار مسٹر بھٹو کے ہاتھ میں رہتا ہے اور وہ اپنی پارٹی کی اصلاح نہیں کرتے، تو ملک مسلسل خلفشار اور انتشار کی نذر گاہ بنا رہے گا۔ حالیہ ہنگاموں نے یہ نہایت خطرناک روایت قائم کر دی ہے کہ مطالبات منوانے کا مؤثر ترین طریق یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کے بعد یہ ملک ایک دن بھی امن و سکون سے رہ سکے گا؟ دوسری طرف، اگر متحدہ محاذ کے ارباب حل و عقد برسر اقتدار آ گئے تو ان کے ماضی کے پیش نظر اس کا اندیشہ ہے کہ ملک کی سالمیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ہمارے نزدیک اس وقت ملک کو ایک ایسا راہ نما بچا سکتا تھا:۔

(۱) جو سیاستدان (POLITICIAN) نہیں بلکہ مدبر (STATESMAN) ہوتا۔

(۲) جس کے جوہر ذاتی، بلندیٔ سیرت و کردار اور بے لچک اصولوں کی بنا پر، نہ صرف یہ کہ قوم کو اس پر کلی اعتماد ہوتا بلکہ اس کے دل میں اس کا احترام بھی ہوتا۔

(۳) جو اس مقصد کو پورا کرنے کا ولولہ دل میں رکھتا جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یعنی قرآنی نظام کے قیام کا جذبۂ صادقہ، جس میں نہ آمریت باقی رہتی ہے نہ مغربی جمہوریت نہ مذہبی پیشوائیت۔ نہ سرمایہ داری نہ سوشلزم۔

سیاستدان (POLITICIAN) کیا ہوتا ہے، اس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مسٹر بھٹو نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ:۔

(۱) متحدہ محاذ کے راہ نما ایک بیرونی سازش کے ایجنٹ ہیں جو ملک کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ انہیں مالی امداد بھی وہیں سے ملتی ہے۔

(۲) تحریک استقلال کا باقی، فوج میں بغاوت پھیلانا چاہتا ہے۔ نیز (نام لئے بغیر کہا کہ) یہ ۱۹۷۱ء کی اس سازش میں بھی ملوث تھا جو حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی تھی۔

(۳) سابقہ دسمبر میں، ایوانِ حکومت میں، قائداعظمؒ کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک نہایت مؤثر تقریر میں

اقتباسات کی تائید سے ثابت کیا کہ جماعت اسلامی کا بانی (مودودی صاحب) تحریک پاکستان کا سخت دشمن اور مخالف رہ چکا ہے۔ اس جماعت کے خلاف یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ یہ مسلح انقلاب کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے، اور اس سازش میں امیر تو اور خود بانی جماعت کے صاحبزادہ بھی ملوث ہیں۔

اور چار دن بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ وہ انہی لوگوں کو شریک حکومت کرنے کے مسئلہ پر مصروف مذاکرات ہو گئے اور ان کے ساتھ بالآخر سمجھوتہ کر لیا۔ اگر یہ لوگ ایسے ہی تھے تو ان کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کے کیا معنی؟

دوسری طرف اتحاد کے وادہ نما ہیں کہ انہوں نے عارضی ہنگاموں میں مسٹر بھٹو کے خلاف جو کچھ کہا، اس سے لوگوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن اب وہی حضرات اسی بھٹو سے بغل گیر ہو رہے ہیں اور ضیافتیں کھا رہے ہیں! اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کہا تھا وہ افترا تھا بہتان تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ قائم اور اس کے ساتھ گلے ملنا بھی۔ اسے کہتے ہیں پالیٹکس، اور ایسے ہوتے ہیں (POLITICIANS)۔

آخری سوال

آخری سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ حکومت نے مودودی صاحب کے خلاف یہ الزام عائد کیا کہ وہ قوت اور تشدد کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور مودودی صاحب نے اس کی سختی سے تردید کی ہے! اس کی بابت کیا خیال ہے؟

جواب:۔ یہ واقعاتی بات ہے جس کا تعلق کسی کے خیال سے نہیں۔ اس کے متعلق تو تحقیق و تفتیش ہی کسی یقینی نتیجہ پر پہنچا سکتی ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مودودی صاحب نے جو کہا ہے کہ وہ ہمیشہ امن پسند رہے ہیں اور انہوں نے کبھی تشدد کا پرچار نہیں کیا، تو یہ صحیح نہیں۔ ان کی متعدد تحریریں اس پر شاہد ہیں کہ وہ شروع سے طاقت اور تشدد کی بنا پر انقلاب لانے کے داعی رہے ہیں۔ ان کی تفصیل بیان کرنے کی اس وقت گنجائش نہیں۔ اسے حسب ضرورت کسی دوسرے وقت پیش کیا جا سکے گا۔

ضروری اعلانات

(۱) جواب طلب امور کے لئے خط کے ہمراہ جوابی لفافہ (یا ٹکٹ) بھیجیں۔

(۲) ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلاقیمت بھیجا جائے گا۔ اس کے بعد قیمتاً بھیجا جائے گا۔ (۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(ناظم ادارہ)

شاہکارِ رسالت

عمرِ فاروقؓ

اپنے انداز کی منفرد کتاب

اکثر سوالات اُبھرتے ہیں کہ :-

- اسلام کا معاشرتی ۔ تمدنی ۔ عسکری ۔ سیاسی ۔ معاشی نظام کیا ہے ؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم بھی ہوا تھا ؟
- ـــــ اگر قائم ہوا تھا تو کب ؟ ـــــ اور اس کا انداز کیا تھا ؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ :-

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا ؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا ؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے ؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

ان سوالات کا نہایت مدلل ، مستند ، معقول ، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب پرویز کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے ۔

- نیز اس میں فقہ ، حدیث ، امامت ، تصوف ، کشف و الہام ، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے ۔

حجم سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف ۔ سفید کاغذ ۔ مضبوط جلد ۔ جاذبِ نگاہ گرد پوش ـــــ قیمت -/۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک) ـــــ ملنے کا پتہ :-

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دینِ دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن	**لاہور** میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۰۰۰۸۰) ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)
کمالیہ میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) (لائلپور) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اقبال بازار	**لیہ** میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان (نمبر ۵ ۳ وارڈ نمبر ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی سکول (بذریعہ ٹیپ)
جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازیخاں) بلوچ جنرل اسٹورز ۔ اڈہ روڈ	**کراچی** میں (عارضی طور پر) ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کمرہ نمبر ۱ ۔ ناز مینشن بالمقابل میری ویدر ٹاور ایم اے جناح روڈ
ملتان میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۰۷۱) دفتر شاہ سنز ۔ بیرون پاک گیٹ	**لائلپور** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۲۹۴) ۴۵ کوتوالی روڈ ۔ حیات سرجری کلینک
گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز ہر اتوار ۲ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی ۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۔ ۱۶۲ لیاقت روڈ
جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	**کوئٹہ** میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) مکان نمبر ۱۷/۴۹ عبدالستار روڈ (نزد گرین ہوٹل)

کاتب کی ضرورت

ادارۂ طلوعِ اسلام کے لئے ایک پختہ قلم، کہنہ مشق، کاتب کی ضرورت ہے جو نستعلیق اور نسخ دونوں میں مہارت رکھتا ہو۔ اتوار کو چھوڑ کر، کسی شام، پانچ بجے سے آٹھ بجے تک، ذیل کے پتہ پر تشریف لائیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ نزد مین مارکیٹ متصل گلبرگ پولیس اسٹیشن لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قوموں کی تعمیر

فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے۔ ہنگاموں سے نہیں!

پرویز

۱۹۶۸-۶۹ء میں اس بدنصیب ملک نے ہنگاموں کا سیلاب دیکھا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ فسادات برپا کئے گئے۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ساری قوم جذبات کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔ اس کے بعد فضا میں قدرے سکون پیدا ہوا تو پرویز صاحب نے، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ایک نہایت بلیغ، بصیرت افروز اور فکر انگیز خطاب پیش کیا جس نے ملک کے اربابِ دانش و بینش کو بے حد متاثر کیا۔ یہ خطاب طلوعِ اسلام میں بھی شائع ہوا، اور اس کا الگ پمفلٹ بھی چھاپا اور ملک میں عام تقسیم کیا گیا۔

ملک میں اب پھر ہنگامے برپا ہوئے تو مختلف گوشوں سے تقاضے موصول ہوئے کہ اس خطاب کو دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ ہنگاموں کی آگ کے شعلے فرو ہوں۔ ان تقاضوں اور اس خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مناسب حک و اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

خطاب

صدرِ گرامی قدر و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت!

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم، بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبۂ محرکہ، جبلی تقاضا ——— (INSTINCTIVE URGE) ہوتا ہے ——— اسی کو، آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں،

جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ حیوانات کے برعکس، انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت، کی روشنی میں غور و فکر کرے، اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا، دلائل و براہین کی رو سے، موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر، اس کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے، اور اس طرح، امکان بھر تدبّر و فکر کے بعد، نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیشِ نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آجاتی ہے ـــ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ اس کا غصہ تیز ہو جاتا ہے ـــــ اس لئے کہ اُس کے پاس، اس کے سوا، مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔ حیوانات کے جبلّی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی، جب تک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو، یا اسے بھوک نہ ستائے، کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اُسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقی ماندہ چارہ کون کھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی ـــــ جسے جبلّی تقاضوں میں، شدید ترین تصوّر کیا جاتا ہے ـــــ فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔

فطرت کا کنٹرول نہیں

لیکن انسان کے جبلّی تقاضوں، یعنی جذبات پر، فطرت نے اپنا کنٹرول عاید نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عاید کرنا پڑتا ہے اور یہ کنٹرول عقل و فکر کی رُو ہی سے عاید کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا، عقل و فکر اور دانش و بینش، باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہرِ انسانیت ہیں، اور جبلّی تقاضوں (جذبات) کی بیباکی، حیوانیت سے بھی پست سطحِ زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے، انسان، حیوانات کے مقابلے میں بڑا کمزور واقع ہوا ہے ـــــ نہ اُسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے، نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے، نہ عقاب جیسا بلند اُڑ سکتا ـــــ لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان، یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں "میری اور تیری" کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو اُن لوگوں نے، جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص و آز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے، اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (EXPLOIT) کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع

اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج، اور رفتہ رفتہ مصلوب کر دیا جائے —

عقول کی جنگ

آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں، باہمی کشمکش (BATTLE OF WITS) یعنی عقول کی جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ حاکم و محکوم، آمر و مامور، مطاع و مطیع، مقتدیٰ و مقتدی، آجر و مستاجر، محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز، اسی کشمکشِ پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے ان لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے، اپنے دامِ تزویر میں لے آئے، اور اس طرح گوشۂ سیاست میں حاکم و آمر، دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ اور اَن داتا بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں اُبھرنے نہ پائیں۔

اسے مذہب کہتے ہیں

اس نظام کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں، مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سُن کر شاید چونک اُٹھیں، کیونکہ مذہب کا تصوّر تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے —— مذہب نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلاتا ہے، خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ:۔

دینِ خداوندی

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ۔ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں —— خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو —— کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه، کے نظریۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ، سب سے پہلے، اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے —— یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد) ہامانیت (مذہبی اقتدار) اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت —— وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ اور ان برخانی سلوں کو اٹھا کر پھینک

دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے جب حضورؐ نبی اکرم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا۔ یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے وہ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کی فکری صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی بلندسے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر، ان کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔

عقل و فکر کی عظمت

آپ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت، تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستحق کون لوگ ہیں۔ وہ کہ: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں، لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ۔ یہ لوگ، انسان نہیں حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے، ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں کیوں ہوتا۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بیباک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۲) آسمانی انقلاب کے اس پیامبرِ عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ: أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي۔ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہو گی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو،

دین میں جبر نہیں

کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ: لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم سے دین بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ شدید جبر و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کر کے کسی سے کوئی بات منوا لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیرالعقول کرامات کے زور سے نہیں منوتا۔ قرآن کے اوّلین مخاطب، جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہتے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہتے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوتِ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، تم سے اپنی بات منوا لوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو؟ چنانچہ آپؐ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ: لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶) سماعت بصارت اور فہم و ادراک، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسول اللہؐ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ۔ میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں، تم اگر اسے ردّ کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رو سے ایسا کرو۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کے رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔

سوچا کرو

نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے، اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلّغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی

ساری تعلیم کا نچوڑ آ جاتا ہے ـــ ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ ان سے کہتے ہیں کہ: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب اکٹھا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رُک جاؤ، اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بصیرت سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں

آپ کو عزیزانِ گرامی قدر! معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنئے، اور غور سے سنئے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا۔ (۲۵/۷۳)

مومن وہ ہیں کہ اور تو اور، جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ـــ ہمارے ہاں لفظِ ایمان کا انگریزی زبان میں ترجمہ (FAITH) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (FAITH) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اس اعترافِ حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، عقل و فکر کی رو سے، کیا جائے۔ اسے آپ (CONVICTION) کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد (FAITH) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت (BY CONVICTION) اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ:

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود زِ راہ و رسمِ منزلہا

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف، تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین، درحقیقت، مذہب کے خلاف چیلنج ہے۔ ضمناً اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ میں نے جو اپنی کتاب کا نام (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) رکھا ہے تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی ہے۔

جذبات، عقل اور وحی

قرآن کریم نے، جذبات، عقل اور وحی کے تعلقات کو، دو آیات میں، اپنے مخصوص حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص، یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔

وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً - اور اس کے سننے، دیکھنے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ...... (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے؟ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ - (۴۶/۲۶) جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوامِ مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے۔ علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی اور قوم شاید ہی اس بلندی پر پہنچ پائی ہو ——

اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جسے اطمینان نصیب ہو۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدارِ خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ: ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار　　عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رو سے عطا ہوتے ہیں۔

یہ تھا وہ دین جسے خدا نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں

حضور رسولِ اکرمؐ نے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔

دین کا نظام

اس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ اور (۴) انسانی عقل و فکر پر، وحی کی مستقل اقدار کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو اپنی نشو و نما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے، صفحۂ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور کیفیت یہ تھی کہ:-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ، مہِ کامل نہ بن جائے

یہ نظام تھوڑی دور چلا تھا کہ استحصالی قوتوں (FORCES OF EXPLOITATION) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ پھر سے مذہب نے لے لی.

دین کی جگہ مذہب

میں اس وقت، عزیزانِ من! اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب و علل کیا تھے۔ یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اگر میں نے اسے، اس مقام پر ضمناً چھیڑا، تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلتِ وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے[ط]

بہرحال، سلب و نہب کی قوتیں پھر ابھریں اور دین کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ان کے پیشِ نظر اولین مقصد یہ تھا کہ عقل و فکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا، یہ بڑی تاریخی تفصیل ہے جس میں، میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت، میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں، اشاعرہ اور معتزلہ کی کش مکش کو یوں بیان کر کے آگے بڑھ جایا جاتا ہے گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی، وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کش مکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب، کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے ——— وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پراپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے، عوام اس کے خلاف امنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں، اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت

ط پرویز صاحب نے اب اسے اپنی معرکہ آرا تصنیف "شاہکارِ رسالتؐ - عمر فاروقؓ" کے آخری باب میں بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے یورپ کی اس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہوگا جس میں مذہب اور عقلیت (RATIONALISM) کی معرکہ آرائیاں، انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آجائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے، خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو، اور فریقِ مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔ ہماری تاریخ میں بھی، عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے اسی قسم کے جھگڑے چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا، اسے تو چھوڑیئے، انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس بحران میں ذرا

تصوّف اور عقل

کمی ہوئی، تو رہی سہی کسر تصوّف کی یونانی یلغار نے پوری کر دی۔ تاریخِ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوّف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اس نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم، قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ قابلِ اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوّف، دونوں نے مل کر، علم و عقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام دین کی خدمت رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں ان سے یہ چراغ تو گل ہوتے ہی تھے، ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیلِ جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں پر باقی رہ گیا۔

میں ابھی ابھی، برادرانِ گرامی قدر! ان معرکہ آرائیوں کا ذکر کر رہا تھا جو گزشتہ چند صدیوں میں، یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کشمکش میں، بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ علماءِ ثینیت کا زوال یہی منتشر ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے۔ مذہب، صرف مزعومہ "خدا پرستی" کا نام نہیں۔ مذہب ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم و عقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر

کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آگیا۔ اس کے

عوامی تحریک

اس جدید لبادہ کا نام، عوامی تحریک یا (MASS MOVEMENT) ہے۔ جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ، سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں، اسی طرح، مذہب کا یہ جدید لبادہ، اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نازی ازم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ عوامی تحریکات، مذہب کے انہی جدید لبادوں کا نام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ یا شورش یا ہیجان (AGITATION) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروانِ انسانیت کا، عقل اور وحی کی روشنی میں، آہستہ آہستہ، نسیمِ سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا ـــــ تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب، جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد، وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں ـــــ یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں، جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے!
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں عام وسائلِ رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے، دنیا کا کوئی حصہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے غیر متاثر رہتے ـــــ اور اصل نکتہ یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں، صدیوں سے مذہب، یعنی عقل و فکر کے خلاف، جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ "بھک سے اڑنے والا" مادہ (EXPLOSIVE) تھا جسے صرف فتیلہ دکھانے کی

ہندی مسلمانوں کی زندگی

دیر تھی کہ وہ شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتداء جنگ بلقان اور طرابلس سے کریں، ۱۹۳۵-۳۶ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، آتشِ سیال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا ذرا سے اشتعال پر، یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ لیکن

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ـــ لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفانِ بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر، انہیں خس و خاشاک کی طرح تذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ بے کراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہانِ پیر کی موت قریب آ گئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد، یہ مضطرب و بے قرار موجیں باہمدگر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطحِ آب پہ ان کا نقشِ قدم تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مذہب پرستی سے اس کی عقل و فکر کی صلاحیتیں مشل ہو چکی تھیں۔ اور یہ مجسم تر جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ سرسید نے ـــ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ـــ تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغِ تیرہ داماں بنا دیا ـــ اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلا تعین منزل، صحرا نوردیوں پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل درد مند سے اک

اقبالؒ کا پیغام

ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں، الہ آباد کے مقام پر، اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا۔ اور قوم کو، اس پر متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن قوم، جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر، مورد طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں، جب اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں، قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ:-

> اگر ان حالات میں، ہمارے لیڈروں نے، قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادثِ زمانہ کے سیلِ بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے

کود پڑے گا۔

تو دوسری طرف سے، ایک نوجوان، انتہائے جوش و خروش میں، یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ:-

عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبۂ دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد، حضرت علامہ نے فرمایا کہ:-

ان شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر" کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر" کی ضرورت ہے —— اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت نہیں رہتی، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

ان کے اپنے الفاظ، جو میرے خیال میں، آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر، تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں، یہ تھے کہ (WHERE THERE IS NO VISION PEOPLE PERISH)

قائدِ اعظمؒ

اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی؛ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ (NO TRUE VOICE IS EVER LOST) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی —— تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے اسے، ان ہنگاموں سے دور بیٹھے، سنا اور اپنے صدفِ قلب میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ —— وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ، متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا فشردہ، اور اقبالؒ کی اس مقدس دعا کی متعین آیت تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ:

ساندی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جو قرآنی فکر کی روشنی میں، سکوتِ دریا میں بط کی سی خاموشی کے ساتھ، جانبِ ساحل رواں دواں چلی جا رہی تھی —— مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار —— اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے، دس سال کی قلیل ترین مدت میں، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر —— حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی دیئے بغیر —— پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی۔ اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا گیا کہ قوموں کی تعمیر، فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں۔ اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں، جن کی کیفیت یہ ہو کہ:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن جس طرح یورپ میں، مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد، عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا، بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہب، جو تحریکِ پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا، پاکستان میں ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا، اور ملک کی فضا کو آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ بنائے چلا گیا۔

(پرویز صاحب نے اس مقام پر ان آندھیوں اور جھکڑوں کی کچھ مثالیں پیش کی تھیں لیکن حالیہ ہنگامے اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لے آئے ہیں کہ اس موضوع پر ضمناً کچھ لکھنا مفید نہیں ہو سکتا۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہئیے۔ بنابریں اس مقام پر ان مثالوں کو حذف کر کے ہم عوامی تحریکوں کی اس اصولی بحث سے سلسلۂ کلام کا اجرا کرتے ہیں جس سے پرویز صاحب نے بات آگے بڑھائی تھی۔)

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی

عوامی تحریک کے عناصر

تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لزومات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا کیا طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ اسے کامل غور و فکر سے سماعت فرمائیں گے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔ ایسے لوگوں کو مذہبی دیوانے (RELIGIOUS FANATICS) کہا جاتا ہے۔

(۲) عوامی تحریک میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں، اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابنِ آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسون پھونکا تھا۔ لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (HAVES) اور (HAVE-NOTS) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو

جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (PRESENT) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذباتِ نفرت کو مشتعل کئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں۔ اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار، اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔

(۳) اس تحریک کے علمبردار حال کو اس قدر قابلِ نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسیوں اور محرومیوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے۔ اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اُسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا، تو وہ دیوانہ وار لپک کر ان کے پیچھے ہو لیں۔

(۴) عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے، مستقبل کے فریبِ تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (FOLLOWERS) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بددل ہو جاتے ہیں۔

(۵) اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ ـــــ وہ آئی، لو وہ آئی، دلِ ناصبور صبح ـــــ ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (TEMPO) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں۔ اس ضمن میں اُس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے، جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دور رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے لمبے

فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ اسی لئے عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔

(۶) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے ـــــ ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

(۷) عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد، وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں، وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ لوگ، اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر، دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۸) عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (THERMOS) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ـــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ـــــ!

(۹) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لابدی ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے، عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہو گا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہو گا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ آرائی کا، اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

(۱۰) مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینا ہے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے، ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (FAITH) کہتے ہیں۔ (FAITH) کی وضاحت برگساں نے بڑے جامع انداز میں کی ہے۔ جب کہا ہے کہ، (FAITH) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں۔ (FAITH) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں، ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

یہ تھے، عزیزانِ من! عوامی تحریک (MASS MOVEMENT) کے لوازم و خصائص۔

عوامی تحریک کے لیڈر

جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے، اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً:-

(۱) وہ اصول پرستی کی جگہ حکمتِ عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس مصلحت کا تقاضا ہو، بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

(۲) اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

(۳) وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو۔ خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا حسنِ عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

(۴) اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے، نہ کسی دوسرے کی بات مانے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیطِ کل سمجھے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود، اور اس طرح اسے (ONE MAN SHOW) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہیں پانے دے گا، جن کے متعلق اُسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد، طبقاتی تفاوت کی شدتِ احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقے کی سطح کو اس قدر بلند کیا

جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں، طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو اُبھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے۔ لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ——— اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں، عزیزانِ من! وہ عناصر جن سے ایک عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گُل کر کے، عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (CHAOS) پیدا کیا جائے اور ایسا کرنے کو خدائی فریضہ قرار دیا جائے۔

کوئی تعمیری کام نہیں

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی، یہاں مذہب کے نام پر ایک عوامی تحریک کی طرح ڈال دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے، غلط نظام زندگی اور ارباب نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے، جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی؛ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی؛ اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس، اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (CHAOS CREATE) کرتے رہے۔

یہ تحریک بڑھتی تو گئی لیکن جن خوش آئند وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا گیا تھا ان کے ایفا ہونے میں اتنا عرصہ لگ گیا کہ اس کے بعد اس کا (TEMPO) قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس

سچائی جمہوریت

وجہ سے اسے اپنا رُخ دوسری طرف موڑنا پڑا اور "سچائی جمہوریت" کے نام سے اس میں نیا ایندھن ڈالا گیا اور پھر اس رو کو وہ رخ دینے، جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا؛ جو تباہی مچائی اس کے نشانات اب تک اس ملبے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس کے نیچے علم و عقل، ہوش و خرد اور تہذیب و شرافت کی لاشوں کو دبایا گیا ہے۱؎

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا ہوں اور میری چشم تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود

۱؎ یہ حقیقت رفقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ خطاب، ۶۹-۱۹۶۸ء کے ہنگاموں کے بعد، ۱۹۷۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔ (طلوع اسلام)

شکنیں آ رہی ہیں جو انتہائی غم و غصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔ یہاں صرف، اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کر رہا ——— غلط نظام کو مٹنا ہی چاہیئے ——— مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا! غلط کو غلط سے مٹائیے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔ صرف اس کے پیکر میں فرق آ جائے گا۔

ہماری پوزیشن

یہ ہے وہ مقام جہاں، عزیزانِ من! ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے ——— میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی رُو سے، مذہبی فرقوں کا وجود شرک ہے اور سیاسی پارٹیاں حکمتِ فرعونی کی مظہر۔ میری تحریک یکسر فکری ہے اس لئے ہم عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے وہ نہ کسی پر تنقید ہے نہ کسی کی تنقیص۔ یہ، میری قرآنی بصیرت کے مطابق، یہاں کے حالات کا معروضی ——— (OBJECTIVE) تجزیہ ہے۔ مجھے دین سے عشق ہے اور پاکستان سے اس لئے محبت کہ یہ سرزمین، دین کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ اور اس کے حصول کی جدوجہد میں میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تھا۔

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اُٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلابِ بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی ——— جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے، ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اُٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں مسٹر گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی، اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا تو اس نے قائد اعظمؒ کو دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے۔ قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو

آج جس سیلاب کا رُخ اپوزیشن کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اُس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہے گا۔ یہی کچھ مَیں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی۔ لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر، ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (LAWLESS NESS) کی زد میں آ رہا ہے۔

قرآن کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ سربلندی قرار دیتا ہے اس کی رُو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل، فلہٰذا ابلیسی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے ——— وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو، اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں، سیکولر نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ فرعون تھا۔

باطل کے نظام

دوسرے، اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا۔ اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔ قرآن کی رُو سے، دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹایا نہ جائے۔ لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے، تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ، فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں

داخلی تبدیلی

قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے ——— تبدیلی پیدا کیا کی جاتی ہے، قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے، اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ———

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (۱۳/۱۱)

جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

ایکہ منزل را نمی دانی ز راہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد، انسانی قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب، جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقائے جلیل کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا۔ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآن کریم کی رُو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (MEANS ARE JUSTIFIED BY ENDS ACHIEVED) میکیاولی سیاست کا اصول ہے۔ قرآن کا نہیں۔ قرآن کی رُو سے، غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین، حق کے مطابق ہونا چاہیئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے حضورؐ نبی اکرم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اُس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی، لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پُرسکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآن کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ: یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ۔ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما ارتقاء بھی ہے۔ جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی

نشو و نما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم، حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔ اور

(۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہؐ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تشکیل (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تئیس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تشکیل میں صرف ہو گئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے، ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو "بے عملی" کا دور کہلائے گی۔

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں ہتھ چھٹ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے، مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں یثرب کی فضا، اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا نہ خیانت کی۔

ط رسول اللہؐ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔ "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے، اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطورِ بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ـــ ایمان ـــ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اعمالِ صالحہ ـــ قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحبِ اقتدار ہو گئی تو معاشرہ میں نظامِ اسلامی خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ـــ انہوں نے پہلے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد، کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ میری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ـــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد، اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا۔ اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں مناسب تعلیم و تربیت سے، ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا۔ اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہوگا جو صحیح اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہو۔

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم میں عزیزوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ ان عزیزوں اور نادداں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ

اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اُس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے، اور نہیں سمجھتے کہ — تا تریاق از عراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود — ؎

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ان بے انصافیوں کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے مسلسل اس کیلئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمّل سے گذاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے — ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بویا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود، فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالب نے یہ کہا تھا کہ — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک — تو اُسے اس کا بھی احساس تھا کہ — عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ

چین کی مثال

نوجوان چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدّ و جہد کی مدّت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے ؎

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کسب جانے
جانتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، انقلابِ چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کیلئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما

اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچیئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات، تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علی حالہ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآن نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے۔ اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے، انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاقِ حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے، ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیشِ نظر مقصد، موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے، تو اس کے لئے بھی نہایت پُرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر سمجھا جائے۔ منتہیٰ، افرادِ قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی، قرار دی جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرت ہے۔ یعنی اس حقیقت پر

ایمان بالآخرۃ

کامل یقین کہ انسان کا کوئی عمل چاہے کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آجائیں اور خواہ مرنے کے بعد — اس ایمان کے بعد، قانون کی اطاعت، یا مستقل اقدار کی پابندی، نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی، نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز، اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ!) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیے کے لئے تیری طرف رجوع کریں۔ یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں، بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کے بعد۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵) اور پھر جو فیصلہ تو دے، اس کے سامنے

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو، آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے۔ اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی، ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا مقصد، افرادِ معاشرہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے عزیزانِ من! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے، تحریکِ پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اور قرآنِ کریم پر غور و تدبّر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے، اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیقِ ایزدی اس بائیس سال[1] کے عرصہ میں، کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر، نہایت خاموشی سے، فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یا گوئٹے کے "نغمۂ محمدؐ" میں اُس آسمانی ندی کی طرح، جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے روشناس کر دیا ہے کہ ؎

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا — اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے قوم سے کہا کہ ہم جس قسم کے مسلمان بھی ہیں، ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس خطۂ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر ابھریں۔ اس سلسلہ میں میں نے پاکستان میں مروجہ طریقِ و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم، اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی — اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں منہمک رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم آج جس قوم کے بالفعل اس قدر نالاں ہیں، وہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم نے بائیس سال سے اپنا

[1] یہ سنہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ اب یہ تحریک بعونہٖ تعالیٰ اور بھی زیادہ پھیل چکی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

تعلیمی نظام درسگاہوں — اسکولوں کالجوں، مکتبوں، دارالعلوموں — میں تیار کئے جا رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے بگڑنے نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے، عزیزانِ من! چاروں طرف سے تھک کر، بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور پر تیار نہیں ہوتی تو ہم انفرادی طور ایک ایسی درسگاہ قائم کریں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درسگاہ میں نصابِ تعلیم تو وہی ہو جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا، تعلیم کے عام میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے کہ طلبا میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کونسی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کونسی ان کے خلاف۔ اور اس کے بعد، ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو دنیا کے سامنے، علومِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل، اس نظام کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

ہم، عزیزانِ من! آجکل اسی درسگاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہیں[1] — کہ یہی ہے آشفتگی کے مرضِ کہن کا چارہ — یہی وہ نوجوان ہوں گے جو عوامی اور ہنگامی تحریکوں کا خس و خاشاک بننے کے بجائے، قرآنی فکری تحریک کا وہ شجرِ طیب بنیں گے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ اس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھولتی — انہی کے ہاتھوں دین کا نظام بھی قائم ہوگا اور یہی، روٹی کے مسئلہ کا صحیح حل بھی پیش کر سکیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ مسولینی نے کہا ہے کہ جس کے پاس [illegible] ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں نے (یعنی علامہ اقبالؒ نے) کہا کہ "یوں نہیں، بلکہ یوں کہ جو خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے"۔

فکر و نظر کی تبدیلی، سیرت و کردار کی پختگی سے انسان کو فولاد بنا دیتی ہے — اور یہ وہ فولاد ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگتا — اور یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا منتہیٰ ہے۔　　والسلام!

---

[1] اس درسگاہ کے لئے پہلا مرحلہ حصولِ اراضی کا تھا۔ دس سال کی تگ و تاز کے بعد یہ مرحلہ آخری منزل میں پہنچا تو ایک صاحبِ اقتدار کے دندانِ آز نے اسے دبوچ لیا۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی دلخراش ہے لیکن ہم اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ مقدمہ ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت ہے۔ اگر وہاں سے فیصلہ ہمارے حق میں بھی ہو گیا تو بھی یہ جو اتنا وقت ضائع ہو گیا ہے، اس کی تلافی کون کر سکے گا؟ ہمارے دور کی تاریخ میں یہ سانحہ بہرحال سیاہ حاشیوں کے اندر رقم کیا جائے گا۔　　(طلوعِ اسلام)

تفسیر مطالب الفرقان کی دوسری جلد

اِس جلد کے نمایاں عنوانات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ انسان کی پیدائش ـــــ نظریۂ ارتقاء
۲۔ نفسِ انسانی کیا ہے؟
۳۔ کیا انسان کی کوئی فطرت ہے؟
۴۔ جن وانس کا مفہوم کیا ہے؟
۵۔ ابلیس کون ہے؟
۶۔ قصۂ آدم ـــ کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے؟
۷۔ ملائکہ کی کنہ وحقیقت۔
۸۔ جنّتِ آدم۔
۹۔ عورت کا مقام۔
۱۰۔ داستانِ بنی اسرائیل ـــــ (قوموں کا عروج وزوال)
۱۱۔ شفاعت کا عقیدہ۔
۱۲۔ سمندر کیسے پھٹا تھا۔
۱۳۔ یہودیوں کے بندر بن جانے کا مفہوم۔
۱۴۔ ذبح گائے ـــــ مردہ کا زندہ ہونا۔
۱۵۔ غلام اور لونڈیاں۔
۱۶۔ ہمارے علماء کی حالت۔
۱۷۔ آنے والے کا عقیدہ ـــــ (مجدّد۔ مہدی۔ نزولِ مسیح ؑ)
۱۸۔ ہاروت وماروت کا افسانہ۔
۱۹۔ جہاد کی حقیقت ـــــ تصوّف اور اسلام
۲۰۔ ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ۔

یہ

ـــــ اور اسی قسم کے دیگر سینکڑوں موضوعات پر سیر حاصل بحث ـــــ
ضخامت پونے پانچ سو صفحات ـــــ عمدہ سفید کاغذ ـــــ اوفسٹ کی طباعت ـــــ
ـــــ خوبصورت، مضبوط، طلائی جلد ـــــ قیمت پچاس روپے ـــــ (علاوہ محصولڈاک)

(مطالب الفرقان، جلد اوّل۔ قیمت چالیس روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبۂ دین ودانش۔ چوک اُردو بازار لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء

بزمِ مذاکرہ

(قسط پنجم)

عنوان :— { سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں }

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء کی مجلسِ مذاکرہ کی تقاریر بالاقساط شائع ہو رہی ہیں۔ چوتھی قسط، طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب پانچویں پیشِ خدمت ہے۔)

۱۰- نجمہ فاروقی

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

محترم باباجی اور سامعینِ کرام۔

انفرادی لحاظ سے ذہنِ انسانی، فکرِ انسانی اور عملِ انسانی کی مجموعی تاریخ اس کی مختصر مدتِ حیات میں کچھ اس قسم کی نظر آتی ہے کہ اگر ایک طرف مسرت و انبساط کی شمع اس کی محفلِ زندگی کو منور کر رہی ہے۔ تو دوسری طرف غم و اندوہ کی بدرنگ خزاں اس گلِ سرسبز کو پژمردہ کر رہی ہے اور اگر ہم اسے اجتماعی طور پر تہذیبی تناظر میں دیکھیں تب بھی نسلِ انسانی کا لامحدود سمندر اسی قسم کے مد و جزر کا تجربہ کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ دورِ جہالت کے ابوالحکم نے جب زمین سے پھوٹتی ہوئی نعمتوں اور آسمان سے موسلا دھار برستی ہوئی رحمتوں کے سرچشمے پر ایمان لانے سے انکار کیا۔ جب حقیقی علم کو یکسر ٹھکرا کر خود ساختہ نکات آفرینیوں کے پھندے میں گرفتار ہوا تو عرفِ عام میں ابوجہل کے نام سے یاد کیا گیا۔

سامعینِ کرام! ابوجہل کسی شخص کا نام نہیں، بلکہ یہ تاریخ کی ایک بہت بڑی جماعت کا نام ہے، جس کے

مقابلہ میں جماعتِ مومنین چراغِ مصطفویؐ کی کرنوں سے معمور، بڑے وقار کے ساتھ اس سے برسرِ پیکار ہے۔

لیکن ایک قابلِ غور پہلو جو ہمارے سامنے علامہ اقبالؒ کی فکرِ بلند پیش کر رہی ہے وہ بندۂ مومن کے مقام ثریا سے زمین پر آ گرنے کا ہے اور اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اس زوال کی اصل وجہ جو اقبالؒ نے بیان فرمائی ہے کہ مسلمان کسی دور میں بے زری کی حیثیت میں آگے بڑھنے سے نہیں رکا۔ اگر ہم چشمِ باطن سے اس عروج کی تحریر دیکھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مادی دولت کو توحید میں گرم جوش مسلمانوں نے کوئی حیثیت نہیں دی، بلکہ وہ تو جس روایت کے حامل رہے ہیں وہ شانِ امارت میں اک شانِ بے نیازی سے تیشۂ الفقر و فخری سے اس بظاہر پرکشش بُت کو پاش پاش کر دینے کی ہے۔ اقبالؒ اسلامی تاریخ کے ایک جگمگاتے ہوئے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی!
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

معزز سامعین! اگرچہ ایک لحاظ سے مال و زر ضرورتِ انسانی میں شامل ہے لیکن شخصیت کی نشو و نما کے لئے ہم اسے بنیادی قدر کی حیثیت نہیں دے سکتے۔ اور تجربہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ جس قوم میں عادات اور مال و زر انسانی خیالات و افعال کا مرکز رہی ہے۔ وہ قوم مقامِ انسانیت سے گر چکی ہے، بلکہ ایک قسم کی ثنویت (DUAL PERSONALITY) کا شکار ہو چکی ہے۔ اور ماڈرن انسان قدیم دور کے باہر کے کسی حد تک انسان اور اندر کے مکمل حیوان کا مرقع دکھائی دیتا ہے۔ کارل مارکس کے الفاظ میں سرمایہ دارانہ معاشرے میں انسانی معاملات پیسے پر مبنی ہوتے ہیں --- اس یورپین معاشرے میں جس میں بدستور وہی روح جاری و ساری ہے، کا اس کے ادب یعنی ..... (LITERATURE) میں جو اظہار ہوا ہے وہ انسان کو مکمل حیوان کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اور مال و زر جن کی نگاہوں کا مرکز بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر (BEN JONSON) کے ڈرامے کا ایک کردار جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی زبان سے خود بخود یہ الفاظ باہر آتے ہیں۔

GOOD MORNING TO THE DAY & NEXT TO THE GOLD

لیکن اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا وجود، تاریخ کی ایک روشن حقیقت اور جس کو اس بات کا شرف حاصل ہوا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے نوازی گئی، انتشار، عدمِ استحکام اور زوال جیسے عذاب سہتی رہی۔ اگر ایک وقت شان و شوکت، غلبہ و استحکام کا عروج حاصل ہوا تو دوسرے وقت اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ عظیم ترین عمارت کے ملبے تلے دفن ہو گئی اور ایک بکھری ہوئی داستان بن کر رہ گئی۔ کیا رہی اس کی حیثیت؟ ایک وسیع اور عظیم گردوں کا جیسے ایک، ٹوٹا ہوا تارا۔ اور پھر سے

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا!

وہ لوگ کہ جنہوں نے سے

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

بعد میں یہ نسبت اپنے آبا سے کھو بیٹھے۔ اس روح کو مردہ کر کے باہمی انتشار و فرقہ بندی کی روح کو زندہ کیا۔ یہ فرقہ بندی ان کی (SUBJECTIVITY) میں رچ بس گئی تھی اور آج بھی ایک شدید ترجیحیت سے انسان کے اندر و باہر موجود ہے۔ زیادہ ظلم تو انسان کے اندر کے انتشار نے کیا جس نے اس میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے اسے ثنویت کا مریض بنا دیا۔ حالت یہ ہوئی کہ موجودہ دور میں کبھی وہ (EITHER-OR) کی صورتِ حال کا شکار ہے۔ قوتِ فیصلہ سے محروم اس سوچ میں گم کہ اب جاؤں کدھر کو میں۔ موجودہ دور کا یہ نفسیاتی مریض ایک فرانسیسی مؤرخ کی دی ہوئی ایک مثال کے مانند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

THERE IS A CLOCK THAT NEVER STRIKES)

یعنی اس قسم کا انسان زندگی میں کبھی مؤثر اور مثبت کام نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے ہماری قوم کے افراد کے اعصاب اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ وہ ایک ٹوٹی ہوئی مالا کی صورت نظر آتے ہیں۔

ذہنی انتشار کی وجہ سے شخصیت میں افراط و تفریط کے مناظر، فساد و استحصال کے مناظر ہیں۔ حفظ و امن کے مناظر ہرگز نہیں۔ ہمارے تمدن کا جزوِ اعظم اسی کمزوری اور نادورس بینی پر مبنی ہے۔ اقوام کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد کا اخلاق و شعور حتی الامکان صانع فطرت کے اخلاق سے مماثل ہو نہ یہ کہ سفلی پیدائش سے ارتقا کیا ہوا انسان پھر اسی درکِ اسفل کی طرف لوٹ جائے۔ ایسی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی، گو کہ اپنے زور کے نشے میں وہ فی الحال اس قدر مست ہو کہ اس خودکشی کا اندازہ نہ کر سکے۔

سامعینِ کرام! ہر زوال پذیر قوم موت کی وادیوں میں جا چکی جس کے بارے میں قرآن نے کہا کہ :-

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ

اور قرآن تاریخی حوالوں سے بتاتا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور قوم لے لیتی ہے جو اس طرح پہنچے زخم کے ہنگام مرہم نکالتی ہے جس کا علاج وہی آبِ نشاط انگیز مشاجرت کی جڑیں کاٹ کر توحید کی طرف رجوع۔ کہ اگر سورج اپنے وقت پر روز چڑھتا ہے تو اسی توحید کے زور پر، اگر چاند کی منزلیں مقرر ہیں اور وہ ان کو نباہ رہا ہے۔ تو اسی توحید کے زور پر اور ملائکہ اپنا کام کر رہے ہیں تو اسی توحید کے زور پر۔ انسانی امتیں جہاں کہیں بھی ابھر رہی ہیں تو اسی وحدت کے نعرہ پر۔ یہ وہ نظام ہے سامعینِ کرام جو زلیخا اور مریم میں واضح فرق کر رہا ہے۔ اور اگر سہ

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

والسلام

۱۱- محمد احمد

اس وقت انسانیت ایک عجیب خلفشار سے دوچار ہے۔ تہذیب و تمدن کے بام عروج پر پہنچنے کے دعوے بھی ہیں اور جنگل کے قوانین کی پیروی بھی ـــــ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے اور امن و آشتی کی نغیرِ جانفزا بھی۔ ہر قوم اپنے ہی پیدا کردہ دامِ فریب کے تاروں میں اُلجھی ہوئی ہے ـــ ظہر الفساد فی البرّ والبحر کی کیفیت ہے ـــ تہذیب و تمدن کے آنگن میں وحشت و بربریت کا دیو ناچ رہا ہے ـــ تباہی و بربادی انسانیت کا مقدر بنتی جا رہی ہے ـــ ہزاروں دل و دماغ اس حسرت انگیز صورتِ حال پر طلسمِ پیچ و تاب بنے ہوئے ہیں ـــ لیکن ـــ اس کش مکش سے نجات پانے کی کوئی راہ، دکھائی نہیں دیتی ـــ ؟

یہ صورتِ حال ہزار انتہائی مایوس کن سہی ـــ نوعِ انسانی کا مستقبل کس قدر بھی بھیانک کیوں نہ دکھائی دے رہا ہو۔ لیکن یہ ایسا نہیں کہ انسان کی سیہ بختیوں کی مستقل تقدیر بن کر رہ جائے ـــ نوعِ انسانی کی تقدیر بالطبع مایوسیوں کی اس تاریکی میں ڈوبی ہے ـــ تاریخِ انسانی کے ابتدائی دور میں ان تاریکیوں میں اجالا پیدا کرنے کے لئے مشیّتِ خداوندی کا پروگرام یہ رہا کہ نبوت و رسالت کا کوئی نہ کوئی حاملِ جلیل وحی کی روشنی لے کر نمودار ہوتا رہا اور روشنی کی یہ قندیلیں تقدیرِ انسانی کے اُفق پر جلوہ بار ہوتی رہیں ـــ لیکن جب ذہنِ انسانی اپنی بلوغت کو پہنچ کر مستقل اور ابدی سہاروں سے کام لینے کے قابل ہو گیا تو آخری نبی کی وساطت سے رشد و ہدایت کی یہ مستقل اقدار قیامت تک کے لئے کتاب اللہ میں محفوظ کر دی گئیں۔ اس کتاب کی وارث جماعتِ مومنین کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ تاریخِ انسانی کے ہر نازک موڑ پر کتاب اللہ کی روشنی میں اقوام و ملل کی رہنمائی اور امامت کا فریضہ ادا کرتی رہتی تاکہ انسانیت کے جہنم کی طرف اٹھنے والے قدم رُک جاتے۔

لیکن ـــ معزز سامعین ـــ یہ نہ صرف نسلِ انسانی کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی بلکہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ تھا کہ ایک قوم مسلمانی کے پُرفریب دعویٰ کے ساتھ اس عالم آرا ضابطۂ رشد و ہدایت کی اجارہ دار بن کر نہ صرف خود اس کی روشنی سے محروم ہو گئی بلکہ اس ناروا تسلط کے باعث پوری نوعِ انسانی کو بھی اس کے لطف و کرم سے بے نصیب کر کے رکھ دیا ـــ اور آج اس کتاب کے زوال پذیر وارثوں اور شکست خوردہ اجارہ داروں کو ذلّ و مسکنت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر کوئی بھی اس کتابِ جلیل سے راہ نمائی پانے کے لئے تیار نہیں۔

صدرِ گرامی! جو قوم اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے اعتراف کا حوصلہ رکھتی ہے۔ یقین کر لیجئے کہ اس میں اپنی اصلاح و بازآفرینی کی صلاحیت زندہ و موجود ہے ـــ ذلت و رسوائی اس قوم کا مقدر بنتی ہے جو اپنی خامیوں کا اعتراف کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اور خود فریبیوں کے وہم و گمان میں مبتلا رہتی ہے ـــ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب ایسی قوم کو کوئی صاحبِ ضربِ کلیم خدا فریبیوں اور خود فریبیوں

کے خواب سے جگانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری ـــــ خدا نے وعدہ کیا تھا جب تک مومن رہو گے سب سے اعلیٰ رہو گے۔ جب تک اللہ کی فوج بنے رہو گے فتح و نصرت تمہارے قدم چومتی رہے گی ـــــ مگر ہم۔ نہ اعلیٰ رہے نہ فاتح و غالب۔ گذشتہ صدیوں میں ہماری عزت و ناموں کے جنازے اٹھے۔ ہماری عظمت کے خزانے سربازار لٹے۔ ہم ذلّ و مسکنت کی عمیق گہرائیوں اور غلامی و محکومی کی دلدلوں میں پھنس گئے ـــــ خدا کے قہر و غضب کی بجلیاں ہمارے خرمنِ حیات پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ـــــ ہم گروہوں میں بٹ کر دین و سیاست کی ثنویت کا شکار ہوئے۔ ہم میں نہ اپنی کمزوریوں اور بدبختیوں کے اعتراف کی جرأت باقی رہی نہ تلافیٔ مافات کے حوصلے زندہ رہے ـــــ ہم مردہ قوموں کی صف میں کھڑے ہیں ـــــ ہاں ـــــ ہم ہیں ظالموں اور فاسقوں کی وہ قوم جو اسلام کی امیدوں کو پورا کرنے میں بے نصیب واقع ہوئی ہیں۔

آیئے آج اپنی اس بے نصیبی اور ظلم کا کھوج لگائیں۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

معزز سامعین! اس ذلت و خواری اور بے آبروئی کا سراغ لگاتے ہوئے جب ہم اپنی تاریخ کے اوراق اُلٹتے ہیں تو ہمیں اس مجرم کا سراغ ملتا ہے جس نے ہماری زندگی کی بنیادیں بدل کر رکھ دیں ـــــ ہماری تاریخ ببانگِ دہل بتائے گی اور قرآن کے محاکمے اس کی بھرپور تائید کریں گے کہ ہم جس معدتِ حال کا شکار ہیں اس کی بنیادی وجہ وہ ملوکیت ہے جس نے پہلے منصبِ خلافت پر قبضہ جمایا اور پھر مذہبی پیشوائیت کے لات و منات وضع کر کے قرنِ اوّل کے نبوی اسلام کو اس خود ساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا جو صدیوں سے اکاس بیل کی طرح اُمتِ مرحومہ کے فکر و عمل کی توانائیوں پر مسلط ہے ـــــ پھر اس مذہب نے ببانگِ دہل خدا کے سچے دین کی عزت و حرمت لوٹی اور خدا کی وہ جنت جس کی آرزو میں صحابہؓ کبار رضؓ تلواروں کے سایہ میں کلمہ پڑھتے تھے۔ تیروں سے چھلنی ہو ہو جاتے تھے۔ جس کی خاطر انہوں نے اپنے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی اور دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں کی بلندیوں اور پستیوں میں اسلام کی جہاں آرائی کا پرچم بلند کرتے زندگی بھر ایک لمحہ چین نصیب نہ ہوا۔ جس کی خاطر وہ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اور کبھی یورپ کے کلیساؤں میں اذانیں دیتے رہے ـــــ وہ جنت ـــــ اس انوکھے مذہب نے جھرات کی باسی روٹیوں، گندی مسواکوں اور استنجے کے ڈھیلوں کے عوض فروخت کی ـــــ ہیضے اور طاعون سے مرنے والے شہیدوں کے مقام تک پہنچا دیئے گئے ـــــ خانقاہوں کے بھنگی اور چرسی اس جنت کی سودے بازی کے لئے خدا کے ایجنٹ قرار پاتے ـــــ خدا کا دین شخصیت پرستی کی بیخ و بن اکھاڑنے آیا تھا لیکن یہاں شخصیتوں کو (معاذ اللہ) خدا سے بڑھ کر درجہ دیا گیا۔ نگاہوں سے اوجھل اور غیر مرئی خدا نے بزرگ و برتر کو ساتویں آسمان کے عرش پر الگ تھلگ بٹھا کر الوہیت کے

پیکرانِ محسوس کو اس کا قائم مقام بنا کر "وحدتِ شہود" اور "وحدت الوجود" کے نئے نئے فلسفے ایجاد کئے گئے — خالقِ باری کی توحید "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کے عجیب تصورات میں بٹ گئی۔ الغرض دینِ حق کا حسنِ عمل تاریخ کا افسانہ بن کر رہ گیا۔ اس کی جگہ عملی دنیا میں ملوکیت کی شعبدہ بازیوں نے لے لی اور اس کا نتیجہ :-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

صدرِ گرامی! ملوکیت کی اس سلطانی و ملائی و پیری کی ہمہ گیر سازش سے آج تک اُمت کو نجات نہیں مل سکی۔ یہ عشوہ طراز نت نئے چولے بدل کر عالمِ اسلام کو مبتلائے فریب کرتے چلے آئے — مغربی جمہوریت کے ڈنکے بجتے دیکھے تو اس نے ہمارے ہاں جمہوریت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے جانشین کبھی پارلیمانی جمہوریت، کبھی بنیادی جمہوریت، کبھی صدارتی جمہوریت کے لئے نئے نئے شاہکار لے کر ہنگامہ آرائے بزم ہوئے لیکن خوئے ملوکانہ پردۂ ساز پر گنگناتی سنائی دی کہ :-

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اس نے سوشلزم کی چشمکِ ناز کی کارفرمائی دیکھی تو عرب سوشلزم، جمہوری سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی نمائشی ساز مسلم ممالک میں بھی فردوس گوش بننے لگی اور انقلاب، انقلاب کی آوازیں گونجیں مگر :-

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی — میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

معزز سامعین! اس وقت پاکستان، بلکہ پورا عالمِ اسلام اپنی تاریخ کے ایک نازک موڑ سے دوچار ہے — اسلام کا مستقبل بیک وقت اس کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی کشمکشِ باہمی کی زد میں ہے — آج میں اسلام کی بات پاکستان کے حوالے سے کروں گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے یہی کہا تھا کہ پاکستان کے حصول کا مقصد اس ٹھپہ کو مٹانا ہے جو عرب ملوکیت نے زبردستی اسلام پر لگا رکھا ہے — یہ ایک نہایت کٹھن مرحلہ تھا جو اس وقت آسانی سے طے کیا جا سکتا تھا جب ملوکیت کی ابلہ فریبیوں کے علی الرغم پاکستان کا حصول ممکن ہوا — مگر تشکیلِ پاکستان کے فوراً بعد مرکزی اور صوبائی وزارتوں کی تشکیل میں لیڈروں کی مختلف سازشوں سے یوں نظر آنے لگا جیسے پاکستان ان لوگوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لئے بنایا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے نوجوانوں سے متعدد بار کہا تھا کہ اپنی صفوں میں سے نئی قیادت ابھارو۔ ایسی قیادت جس کی نظر اقتدار پر نہ ہو، نظریۂ پاکستان پر ہو اور جو اس نظریے کا تحفظ کرے جس کی جلا اور بقا کے لئے یہ خطہ حاصل کیا گیا ہے۔

وہ نظریہ کیا تھا؟ یہ نظریہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب چاہئیے تو کتابوں کی وسعت درکار ہے۔ اور اختصار سے بیان کیجئے تو بات اتنی سی ہے کہ یہ قرآن کی سرزمین ہے۔ جس کا طرزِ حکومت اور نظامِ معاشرت قرآن کے اصولوں کا پابند ہو گا۔ اور اس سرزمین کو دارالاسلام بنایا جائے گا — مگر ہوا یوں کہ ہمارے ذہن سے پاکستان کا بنیادی نظریہ نکل گیا — دستورِ خداوندی کی جگہ انسانی دستور نافذ ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسل کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ پاکستان کیوں اور

کس طرح حاصل کیا گیا تھا؟

حصولِ پاکستان، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی شکست تھی۔ ——— مگر اس کے ایجنٹ اس مقصد میں مصروفِ تگ و تاز ہیں کہ اب اس مملکت میں وہ نظام نافذ نہ ہو جائے جس کے لئے یہ حاصل کیا گیا تھا ——— ہوا یہ ——— کہ ہماری فکر و عمل کی توانائیاں مفلوج کر کے رکھ دی گئیں، اور غیر ملکی نظامِ حکومت ہم پر مسلط کر دیئے گئے ——— جس کی بنا پر ہم دین اور سیاست کی ثنویت کا شکار ہوئے اور آج تک سیاسی پارٹیوں اور تفرقہ بازی کے شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ تفرقہ بازی فرعون کی چال ہے۔ لیکن ہر فرعونے را موسےٰ کے مصداق، قرآن کا نظام فرعونی حربوں کو ناکام بنانے کے درپے ہے۔ وہ نظام واضح اور نکھر کر سامنے آ چکا ہے۔ جو اس مردِ قلندر کی شب و روز کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ——— ان کاوشوں کا حق بجانب ہونا ثابت ہے کیونکہ مذہبی پیشوائیت کے ترکش کے آخری تیر آزمائے جا چکے ہیں۔ قرآنی نظام کے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانا اب ہمارا کام ہے۔ اس کے لئے ہمیں پاگل اور سر پھرے کہا جائے گا ——— بلکہ کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔

۲۸-۱۹۲۷ء میں تحریکِ پاکستان کی ابتدا چند نوجوانوں نے کی تھی۔ انہوں نے باہر نکل کر پاکستان کا نام لیا تھا تو ہندوؤں اور سکھوں سے پہلے مسلمان لیڈروں نے ان کی صرف مخالفت ہی نہیں کی تھی، بلکہ ان کا مذاق اڑایا تھا ——— اس وقت لاہور میں تین مسلمان اخبار تھے ان کے ایڈیٹروں نے ان نوجوان کی بات تک سننا گوارا نہ کی ——— علامہ اقبالؒ نے تصوّرِ پاکستان تو تخلیق کر لیا تھا مگر اس کی تشہیر ناممکن نظر آتی تھی ——— کتنے علمائے کرام اور لیڈرانِ قوم تھے جنہوں نے ان نوجوانوں کو دھتکارا انہیں پاگل اور سر پھرے کہا تھا ——— جس طرح آج قرآن کا نام لینے والوں کو کہا جاتا ہے ——— لیکن تھوڑے عرصے میں ان پاگلوں اور سر پھروں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ ساتھ انگریزوں اور ہندوؤں کا دماغ درست کر دیا اور انہیں ذرا بہتر طریقے پر سوچنے پر مجبور کر دیا۔

تحریکِ پاکستان نے وہ فضا پیدا کر دی کہ ایسے لیڈر اُبھرے جنہیں برِصغیر کی سیاسی دنیا جانتی پہچانتی ہی نہیں تھی۔ محمد علی جناحؒ کے نام سے بھی قوم واقف نہیں تھی۔ یہ دُبلا پتلا...... انگریز نما مسلمان، جب پاکستان کا نعرہ لے کر سیاست کے میدان میں آیا تو علمائے کرام نے اس کے خلاف فتوے صادر فرمائے دیگر لیڈروں نے مذہب کی آڑ لے کر قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ شخص نام کا مسلمان ہے۔ انگلینڈ سے آیا ہے۔ اس کی داڑھی نہیں ہے۔ یہ انگریزوں کا پروردہ ہے۔ حد یہ کہ اس کو کافر تک کہا گیا ——— آخر علمائے کرام کے فتوے کے مطابق قرار دیا ہوا یہ شخص ایک نئی اسلامی مملکت کا بانی مبانی بنا اور صرف اپنی قوم میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں قائدِ اعظمؒ کہلایا۔

معزز سامعین! میرے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ نصب العین کا تعین اور ذرائع سفر کا فیصلہ قوموں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا۔ ہم نے یہ انقلاب برپا کرنا ہے۔

برِصغیر میں مسلمان جب تحریکِ پاکستان تلے جمع ہوئے تھے تو انگریز جیسی بہم جو قوم نے کہا تھا کہ ہم

ہندوستان کو آزاد کر دیں گے، لیکن ایک ملک کے دو ٹکڑے کیونکر ہو سکتے ہیں؟ یہ تو اَن ہونی سی بات ہے لیکن مسلمانوں نے اس اَن ہونی کو ہونی کر دکھایا۔ اور ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یہ نصب العین کی صداقت اور عملِ پیہم کا نتیجہ تھا۔ اور جب یہ نصب العینی آنکھوں سے اوجھل ہوا اور ہمارا عمل اس مقصد کے خلاف شروع ہوا تو ہم نے پہلے ہی ملک کے کہنے کو دو، لیکن درحقیقت کئی ایک ٹکڑے کر دیئے ــــ اب ہم نے ان ٹکڑوں کو جوڑنا ہے۔ ملک کے ٹکڑے یکجا کرنے کیلئے ہمیں اپنے دین و ایمان کے بکھرے ہوئے ذرّے یکجا کرنے ہوں گے۔

ہم نے یہ خطۂ زمین بڑی قربانی دے کر حاصل کیا ہے ــــ ذرا ان معصوم بچوں کو یاد کر لیا کریں جن کی لہولہان لاشوں کو ہم اگست ۱۹۴۷ء میں سرحد پار پھینک آئے تھے۔ اور ان بہنوں اور بیٹیوں کو یاد رکھئے جن کی عصمتیں لٹیں اور جنہیں بھارت کے شہروں میں ننگا پھرایا گیا۔ کلکتہ کے بازاروں میں بکنے والا جوان خون کسی محمد بن قاسم کو پکار رہا ہے ــــ محمد بن قاسم کسی سیاست کی پیداوار نہیں تھا، وہ ایک جذبے کا نام تھا ــــ ہمیں وہ جذبہ پیدا کرنا ہوگا ــــ لیکن یہ اپنے آپ میں انقلاب لائے بغیر ممکن نہیں ــــ اس کے لئے ہمیں قرآن کے احکامات و اصولوں کی پیروی کرنی ہوگی اور اپنے اندر عسکری جذبہ بیدار کرنا ہوگا ــــ کفر اسلام کے خلاف ہمیشہ محاذ آرا رہا ہے اور محاذ آرا ہی رہے گا ــــ آپ کو اپنی صفوں میں بھی دشمن ملیں گے۔ ہم نے اپنی صفوں سے دشمن کو نکالنا ہے اور اپنے دلوں سے بھی جو غلط تصوراتِ زندگی کے روپ میں ہمارے سینوں میں جاگزیں ہے ــــ دشمن کو پاکستان کھٹکتا ہے ــــ یہودی اور ہندو مل کر اس مملکت کو ختم کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اور ملوکیت و مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری حربے ان کا ساتھ دے رہے ہیں ــــ یہودی وہ قوم ہے جس نے صلاح الدین ایوبی کی مرکزی کمان میں اور اس کے کمانڈروں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے اپنی بیٹیوں کی عصمت بطور ہتھیار استعمال کی تھی۔ وہ اب بھی یہ ہتھیار استعمال کر رہا ہے ــــ اب یہ سب کچھ کلچر، تہذیب اور ثقافت کے نام پر ہو رہا ہے۔ دشمن ہماری کردار کشی کر رہا ہے۔ وہ بار بار ہماری نظریاتی سرحدوں پر حملے کر رہا ہے جس کے نتیجے میں ہم بھولتے جا رہے ہیں کہ پاکستان کیوں حاصل کیا گیا تھا؟

میں محسوس کر رہا ہوں کہ زمین تیزی سے ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکل رہی ہے۔ میں اس جگہ دردمندانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اگر ہم فوراً نہ سنبھلے تو خدانخواستہ ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو سپین میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔

میرے دوستو! ہم نے پاکستان میں اس نظام کو قائم کرنا ہے جس کے لئے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔ تاکہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ ماضی کے وہ چراغ اٹھا کر مستقبل کی گذرگاہوں پر رکھ دیں جن کی روشنی میں قافلۂ اسلام ایک بار پھر وہی منازل دیکھ لے جن کی گذرگاہوں پر ان کے اسلاف کے قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ سوئے ہوئے جذبے ایک بار پھر بیدار ہو جائیں۔

مظلوموں کے ہاتھ پھر شہنشاہوں کی قبائیں نوچ سکیں۔ اور پھر جب تک زمین کی وسعتیں ختم نہ ہوں قافلۂ اسلام کا سفر جاری ہے۔

میرے نوجوان دوستو! اپنے اس مشن کی تکمیل کی خاطر مٹی کے بُت بن کر مت بیٹھو۔ آپ نے بہت سے بت توڑنے ہیں ـــــ اس کے لئے اپنے آپ کو جاننا ہوگا۔ اپنے آپ کو جاننے کا مقصد سیرت کی پختگی اور انسانی ذات کا استحکام ہے ـــــ جب اپنے اندر انقلاب بپا ہوتا ہے تو خارجی انقلاب عمل میں آتا ہے ـــــ داخلی انقلاب ہی سب سے کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے فردی استقامت اور کوہکنی استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ راستہ بڑا صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے جس میں خالی جذبات کی ولولہ انگیزی کچھ کام نہیں آتی بلکہ تخریبی نتائج پیدا کرتی ہے ـــــ ہم نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ ہم افرادِ معاشرہ کے دل و دماغ میں وہ تبدیلی لانے کے خواہشمند ہیں جس سے زندگی بدل جائے۔ اقدارِ حیات بدل جائیں۔ بلکہ یہ زمین بدل جائے، آسمان بدل جائے۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

۱۲۔ حاجی عبدالقیوم

صدرِ محترم، واجب الاحترام بزرگو اور عزیز ساتھیو!

السلام علیکم۔

یوں تو اس قطعۂ ارض پر جملہ بنی نوع انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف و فضیلت حاصل ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۔ (۱۷/۷۰)

لیکن جب کوئی گروہ اپنے شرف و مجد کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور اس روش سے انحراف کرتا ہے جو خالقِ کائنات نے اس کے لئے متعین کی ہے تو وہ زندگی کے بلند معیار سے گر کر پست سطح پر آ جاتا ہے ـــــ ایسی پست سطح، جو نہ صرف مقامِ آدمیت کے شایانِ شان نہیں ہوتی بلکہ حیوانات سے بھی پست تر ہوتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ (۷/۱۷۹)

جب انسانی سوسائٹی انسانیت کے شایانِ شان سطح سے نچلی سطح کی طرف گرنا شروع ہوتی ہے تو اسے اس کا زوال آشنا ہونا کہا جاتا ہے۔

جنابِ صدر! خالقِ کائنات نے نوعِ انسان کی ترقی و نشوونما کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے اس کے حوالہ سے نسلِ آدم دو طبقوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲)

یعنی مومن اور کافر۔ ان میں ایک گروہ وہ ہے جو خالقِ کائنات کے بتائے ہوئے طریق پر اعتماد اور عمل کر کے امن و سعادت کی راہ پاتا ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو اس روش سے انحراف کر کے اپنی امکانی صلاحیتوں اور خدا بیدہ جواہر کو نہ صرف بروئے کار نہیں لاتا بلکہ اسے مٹی میں ملا دیتا ہے۔ مؤخر الذکر دنیا میں کس طرح کی زندگی گذارتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ لیکن اوّل الذکر جسے قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے ——— اس کے متعلق اس کا ارشاد ہے :-

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ——— (۳/۱۳۹)

یعنی ——— اگر تم مومن ہو تو تم ہی سب سے اعلیٰ و ارفع ہو۔

صدرِ ذیشان! دنیا کے کسی مقام پر اگر کوئی مومن کہلانے کا دعویدار ہو اور اس کی زندگی، دوسروں سے متمیز نہ ہو تو یہ مقام دو باتوں سے خالی نہیں۔ یا تو معاذ اللہ خالقِ فطرت کا قانون اور وعدہ غلط ہے یا پھر ایسا دعویدار خود فریبی میں مبتلا ہے۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب نوعِ انسانی کے ایک پس ماندہ ٹکڑے نے اللہ تبارک تعالیٰ کے بتائے ہوئے ایمان اور عملِ صالح کے طریق کو اپنایا تو چند ہی سالوں میں یہ گروہ اپنی ہم عصر اقوام پر فضیلت حاصل کر گیا۔ رسولِ پاک کی تعلیم اور اُسوۂ حسنہ کی برکات سے جو کامیابی ہوئی اس کا اقرار دوست دشمن سب کو ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کارلائل (CARLYLE) کے بیان کے مطابق۔ "وہ قوم جو صحرا نوردی کی زندگی بسر کرتی تھی اور صدیوں گمنام رہی نبیؐ عربی کے ظہور کے بعد علوم و معارف میں ساری دنیا کی قبلۂ امید بن گئی اور اس نے اپنے نبیؐ کے ذریعے اتنی شوکت اور قوت حاصل کر لی کہ ایک صدی کے اندر اندر پورا کرۂ ارض اس کی عقل اور اس کے علوم سے پُر نور ہو گیا"۔

صدرِ گرامی قدر! یہ ایمان اور اُس پر مبنی عملِ صالح کا نتیجہ تھا جو وعدۂ خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوا۔ اسی ایمان کے نتیجہ میں ایک جاہل اور اُجڈ بدو قوم کو دنیا کی امامت اور استخلاف فی الارض حاصل ہوا۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں آیا ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

یعنی ——— اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائے اور عملِ صالح کئے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین کے اندر استخلاف (حکومت) عطا فرمائے گا۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ——— کے بارے میں خدا کا وعدہ تو ہرگز جھوٹا نہیں۔ جیسا کہ صدرِ اوّل کی تاریخ شہادت دیتی ہے ——— اگر آج مومن سرفراز نہیں تو فرق کس

اس کے ایمان ہی کا نظر آتا ہے۔

صدرِ محترم! بادی النظر میں عروج و زوال کو ماپنے والے شوکت و حشمت، مال و دولت، اور جاہ و جلال کی نسبتوں سے ماپا کرتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں عروج و زوال کے ثمرات و علامات تو ہیں لیکن بنیادی اسباب نہیں۔ ایک قوم اگر جاہ و حشمت، شان و شوکت، مال و دولت، عزت و رفعت، وسائل و طرق کی مالک نہیں تو یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ زوال آشنا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان چیزوں کا نہ ہونا اس کے زوال کا سبب ہے۔ عروج و زوال کی وابستگی انسان اور اس کے اس طریقِ عمل سے ہے جس سے وہ اشیائے کائنات کو (DEAL) کرتا ہے۔ عروج و زوال انسان سے پہلے نہیں اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔ اشیائے کائنات انسان کی (DISPOSAL) پر ہیں۔ انسان ان چیزوں کی (DISPOSAL) یا رحم و کرم پر نہیں۔ انسان تھا تو اس کے کسی طرزِ عمل کے سبب اس کو عروج و زوال حاصل ہوا ـــــ یہ نہیں کہ ناداری اور تہی دامنی کے باعث اسے زوال آشنا ہونا پڑا۔ انسان کے مستقبل کی تعمیر و تخریب کا مدار اس کی سعی و عمل پر ہے۔ جیسا کہ خالقِ کائنات نے فرمایا ہے:۔

لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ـــــ (۳۹/۵۳)

انسان اپنی سعی و عمل کے سبب سے اچھے یا بُرے حالات سے دوچار ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ مومن کے زوال کا سبب "بے زری" ہے۔ خلافِ واقعہ، خلافِ مشاہدہ اور خلافِ حقیقت ہے۔

صدرِ محفل! جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جماعتِ مومنین کے علاوہ دیگر نوعِ انسانی کے زوال و عروج کے اسباب آپ جیسے بھی تلاش کریں وہ بجا اور درست ہوں گے۔ لیکن جہاں تک بندۂ مومن کے زوال کا تعلق ہے اس کا سبب اس جذبۂ صادقہ کے فقدان کا نتیجہ ہے جسے "ایمان" کہا جاتا ہے۔ جہاں تک ایمانی کیفیات کا تعلق ہے کچھ لوگ ایسے ہیں:۔

مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ۔ (۲/۸)

"جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یومِ آخرت پر جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے"

ایسے ہی ہیں وہ لوگ جو اپنی کوتاہیٔ عمل کے سبب سے پیدا ہونے والے زوال کو "بے زری" میں تلاش کرتے ہیں۔ منافقت کی یہ روش ان کی داخلی نفسیات کو وقتِ اضطراب بخشتی ہے اور حیات کے متعلق کذب کی جو روش وہ اختیار کرتے ہیں اس سے ان کا معاشرہ اَلم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں لیکن نہ تو ایمان کی کیفیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ کتابِ الٰہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے چند حسبِ پسند حصوں کو اپنی تسکینِ طبع کے لئے اختیار کرتے ہیں اور دیگر حصوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ جبکہ خدا کے حکم اور مومنوں کے ایمان کا تقاضا ہے کہ:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً ۔ (۲/۲۰۸)

یعنی ـــ اسلام کے نظام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ ۔ ـــ یہی ہے وہ سبب، جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط (۲/۸۵)

کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے ایک حصے پر اور کفر کرتے ہو دوسرے حصے سے۔ جو کوئی بھی تم میں سے یہ روش اختیار کرے گا اس کی جزا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اسے اس دنیا کی زندگی میں رسوائی میسر آئے گی اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ۔

کتاب کے بعض حصوں پر ایمان اور بعض سے انکار کا مفہوم کیا ہے اسے قرآن کریم کی اس آیت کے حوالہ سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اس قرآن کریم پر عمل کرنے سے بہتوں کو ہدایت ملتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے بہت سی جماعتیں گمراہ ہو جاتی ہیں ـــ لیکن گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق (PATTERN) کے مطابق عمل نہیں کرتے اور اس کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں اور جس چیز کو خدا نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے منقطع کرتے ہیں اور یوں زمین کے اوپر فساد برپا کرتے ہیں۔

حاضرین ! اللہ نے کن چیزوں کو ملانے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے ایک تو وحدتِ انسانیت ہے کہ اس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرے حیاتِ انسانی ہے جو ایک جوئے رواں ہے۔ اسے دنیا اور آخرت کی زندگی میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ ـــ

یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ ـــ (۲/۲۷)

کے مرتکب ہوتے ہیں وہ نوعِ انسانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، اسے طبقات میں تقسیم کر کے، اسے شعبوں میں بانٹ کر کتابِ الٰہی کے بعض احکام کو معرض عمل لاتے ہیں اور بعض پر عمل نہیں کرتے۔ اسی طرح سے یہ لوگ دنیا اور آخرت کی زندگی کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتے ہیں جس کے لئے دنیاوی معاملات کسی اور ضابطہ کے تحت اور اُخروی معاملات کسی اور قانون کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں۔ اس تقسیمِ حیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں ثنویت (DUALISM) آ جاتی ہے جس میں اُخروی زندگی کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں اور جن سے انہیں محض "ثواب" ملتا ہے۔ اس کا دائرہ الگ ہو جاتا ہے اور دنیاوی زندگی کے معاملات کا دائرہ الگ۔ دنیاوی زندگی بادشاہوں اور سیاسی رہنماؤں کے قبضہ میں چلی

جاتی ہے جسے وہ اپنی حسبِ منشا جس طرح چاہیں استعمال کرتے ہیں اور آخرت سے متعلق امور کا دائرہ مذہبی پیشوائیت کے زیرِ اقتدار آجاتا ہے۔ زندگی کی یہی ثنویت ہے جسے قرآن نے:

تُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔

کہہ کر پکارا ہے۔ اور اسی کی سزا دنیا کی رسوائی اور عذابِ آخرت کو قرار دیا ہے۔

صدرِ گرامی قدر! ایمان کے ان دعویداروں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عمل تو ان باتوں پر کرتے ہیں جو ان کی خود ساختہ ہوتی ہیں اور جنہیں انہوں نے خدا کی طرف منسوب کر رکھا ہوتا ہے۔ لیکن کتاب اللہ کو صرف "ثواب" کی خاطر پڑھنے کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ مذہب پرستوں کا یہ گروہ اس کے عوض کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اس سبب سے کہ وہ خود کو، اور اپنے متبعین کو کتابِ الٰہی سے دور رکھتا ہے، عذاب و رسوائی کی دعوت دیتا ہے ——— قرآنِ کریم میں ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۔ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۲/۷۸-۷۹)

یعنی ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتابِ خداوندی کو محض اپنی آرزوؤں کی حد تک تسلیم کرتے ہیں اور اگر اس سے کچھ تعلق رکھتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ اس کی محض تلاوت کر لی جائے۔ حتیٰ کہ زندگی کے مسائل کا حل ظن و تخمین کی بنیاد پر تلاش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے رسوائی ہے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر ان ظن و گمان پر مبنی باتوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے سے دنیاوی مفاد حاصل کر لیں۔ جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر خدا پر افترا باندھا ہے یا دین، اور کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال کر محض دنیاوی مفاد کے لئے یہ کچھ کیا ہے ——— یہ ان کے لئے خرابی اور رسوائی کا سبب بن جائے گا۔

جنابِ عالی وقار! مذہبی پیشوائیت جو کسی معاشرہ کے زوال کا حقیقی سبب بنتی ہے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ احکامِ خداوندی کو معاشرہ میں عملاً نافذ نہ ہونے دے کہ اس سے اس کا اپنا اقتدار ختم ہوتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عوام الناس کو "ایمان" کا ایک "موہوم تصور" تو دیا جائے لیکن وہ حقیقی ایمان کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔ دیکھئے قرآنِ کریم اس حقیقت کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا دُعُوْٓا

إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ ۝ (۲۴/۴۸)

وہ کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور ہم نے اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ پھر ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔ حالانکہ یہ دعویدارانِ ایمان فی الحقیقت مومنین نہیں ہیں کیونکہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بدیں غرض بلایا جاتا ہے کہ احکامِ خداوندی کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے تو ان میں کا ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔

سامعین کرام! مذہبی پیشوائیت پر درحقیقت یہ امر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کے فتاویٰ چلنے بند ہو جائیں اور اس کی بجائے لوگ مرکزِ ملتِ اسلامیہ کی طرف اس لئے رجوع کریں کہ وہ تمام مسائل کا حل احکامِ خداوندی کے مطابق پیش کرے۔ یہی ہے وہ چیز جو آج کے مسلمان کی ذلت و نکبت کا سبب ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے مسلمانوں کو اسلامی حکومت کے قیام کے تصور ہی سے ناآشنا اور نفور رکھا ہوا ہے اور اس کی بجائے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اپنے احکامات پر عمل کرنے کو قرار دے رکھا ہے۔ جبتک یہ مذہبی پیشوائیت اور ان کے متبعین۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ۔

کا جواب عملی اطاعت کی شکل میں نہیں دیتے یعنی اسلامی حکومت کا قیام۔ اس غرض نہیں کرتے کہ ان کے معاملات "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" کے مطابق حل کئے جائیں۔ اس وقت تک بندۂ مومن کا زوال مبدل بہ عروج و ارتقا نہیں ہو سکتا۔

صاحبِ صدر! کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جس معاشرہ میں علم و بصیرت کی کمی آ جاتی ہے وہ رو بہ تنزل ہو جایا کرتا ہے۔ بے شک کسی رو بہ زوال قوم کی علامتوں میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس کے معاملات علم و بصیرت کی بجائے تقلید کی رو سے حل ہوتے ہیں لیکن زوال کا اصل سبب علم و بصیرت کا فقدان نہیں بلکہ آیاتِ الٰہی اور احکامِ خداوندی سے روگردانی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے:۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۶/۲۶)

کتنی ہی مجرم قوموں کو ہم نے تباہ کیا جنہیں تم سے زیادہ تمکنت و غلبہ حاصل ہوا تھا اور وہ تم سے زیادہ علم و بصیرت کی حامل تھیں۔ پس ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا جب انہوں نے آیات اللہ کا انکار کیا اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جو لوگ زمین میں قوت و اقتدار کو عروج اور ترقی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں ان کا نکتۂ نظر بھی صحیح نظر نہیں آتا۔ کیونکہ نکبت اور زبوں حالی کا اصل سبب قوانینِ قرآنی کا انکار ہے۔ قرآن کریم نے اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے۔

کیا وہ زمین میں گھومے پھرے نہیں تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اُن لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے کیا انجام ہوا۔ وہ ان کی نسبت قوت و اقتدار میں کہیں زیادہ تھے لیکن ان کی کارکردگی ان کے کسی کام نہ آئی۔ جب ہمارے رسول ان کے پاس واضح آیات لے کر آئے تو انہوں نے اپنے اس علم کے زعم پر، جو انہیں حاصل تھا انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے، اس نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ (۴۰/۸۲-۸۳)

اللہ تعالیٰ نے اسی کیفیت کو ایک ایسی بستی کی مثال دے کر سمجھایا ہے جس میں امن و اطمینان پایا جاتا تھا، اور ہر طرف سے بافراغت رزق اس کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ (ایسے حالات میں یہ سمجھنا کہ یہ بستی زوال آشنا ہو جائے گی کچھ تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے) لیکن اس بستی والوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ربوبیتِ عالمینی کے مقاصد کے لئے صرف نہ کیا بلکہ انہیں چھپا کر رکھ لیا، اور یوں احکامِ خداوندی کا انکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :-

بھوک اور خوف کا عذاب اُن پر مسلط ہو گیا۔ (۱۶/۱۱۲)

حضرات! ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کسی قوم، خصوصاً وہ قوم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے' کے زوال کا سبب ناداری و تہی دامنی یا بے زری نہیں بلکہ احکامِ الٰہی سے سرکشی اور آیاتِ الٰہی کا انکار ہے اور اس حقیقت سے روگردانی کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق نہ معاشرہ کی تشکیل کی جائے اور نہ نظامِ حکومت کو چلایا جائے۔

صدرِ گرامی! عروج و ارتقا اور ترقی و خوشحالی ـــــ ذرائع و اسباب کی نسبت ایمان و تقویٰ کی زیادہ محتاج ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے :-

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۶)

اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں تمہارے اس ایمان و اعمالِ صالح کا اجر دیا جائیگا اور خدا کا تقاضا تم سے ایمان و تقویٰ کا ہے وہ تم سے تمہارے مال نہیں مانگتا۔

مسلمان جب بھی اپنے گریبان میں جھانکے گا تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھے گا۔ ع

سبب یہی ہے جسے تو بھی خود سمجھتا ہے

ایمان و تقویٰ کی اسی حقیقت کو حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے خودی کی چنگاری سے تعبیر کیا ہے جب کہا ہے

تیری ذات میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

والسلام

۱۳ ——— تین بچوں کی ایک ایک منٹ کی تقریر

(۱) فوزیہ سرور

پیارے باباجی، قابلِ احترام صدر، اور معزز حاضرین!

شعر وغیرہ تو ہیں سمجھتی نہیں۔ مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ امیّ ابوؐ کا حکم ماننے کے لئے مجھے اپنا جیب خرچ ذرا بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ اللہ میاں کے حکم پہ چلنے کے لئے بھی پیسوں ویسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

کیوں ——— ٹھیک ہے نا؟

---

(۲) گوگی

میرے بزرگو! السلام علیکم

ہمارے اسکول میں ایک لڑکا ہے۔ مزدور کا بیٹا۔ غریبی کا یہ عالم.... کہ نہ فیس دینے کی طاقت، نہ کتابیں خریدنے کی ہمت۔ لیکن کلاس میں ہمیشہ فرسٹ سکینڈ کرتا چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا۔ ع

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

---

(۳) رانی

اور ہمارے اسکول میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی۔ بہت بڑے امیر ماں باپ کی بیٹی۔ اسکول آتی تو موٹر میں، اور ساتھ ایک ملازم ہوتا بستہ اٹھانے کے لئے۔ اس کے پاس اچھے اچھے قیمتی پن بھی ہوتے۔ لیکن وہ لڑکیوں کی پنسلیں چرا لیا کرتی۔ کئی دفعہ پکڑی بھی گئی۔ لیکن وہ چوری کرنے سے باز نہ آئی۔ اس سے میں یہ سمجھی کہ، ع

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

برائے توجہ بزم اراکین طلوعِ اسلام کراچی

جملہ اراکین بزم سے گذارش ہے کہ وہ صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے دوپہر تک کے اوقات میں۔ کمرہ ۲ - اے ٹاور مینشن میری ویدر ٹاور (ایم اے جناح روڈ) پہ نمائندہ سے رابطہ قائم کریں۔ (ناظم)